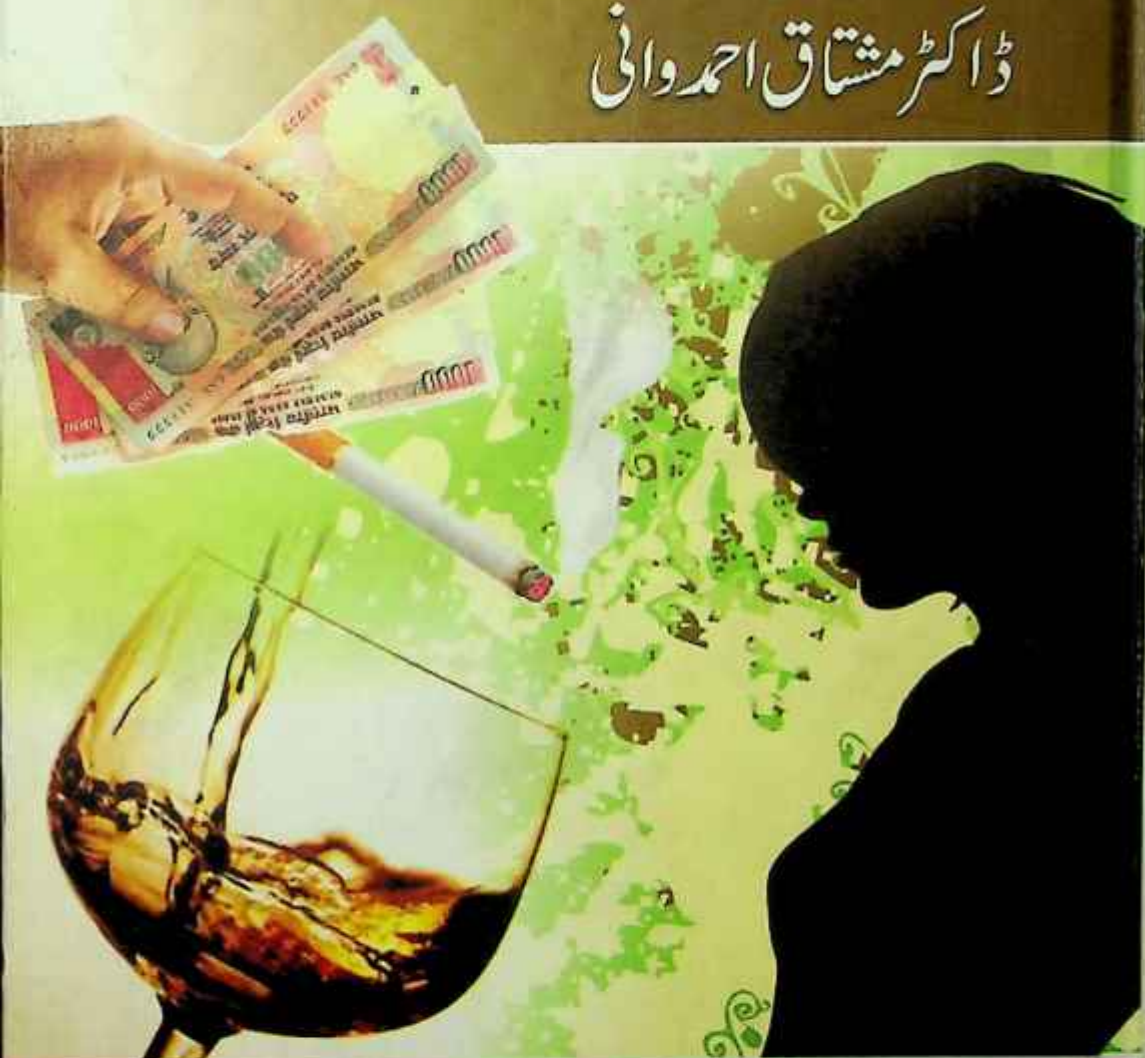


ڈاکٹر مشتاق احمد وانی



اندر کی باتیں (افسانے)

اندر کی باتیں

(افسانے)



ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ!

نوٹ: افسانوں کے اس مجموعے کے تمام کردار و واقعات فرضی ہیں۔

ANDAR KI BATEIN

(Short Stories)

by

Dr. Mushtaq Ahmed Wani

Year of Edition Sep. 2015

ISBN 978-93-5073-707-1

₹ 350/- (Library Edition)

نام کتاب	: اندر کی باتیں (افسانے)
مصنف	: ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سنہ اشاعت	: ستمبر ۲۰۱۵ء
قیمت	: ۳۵۰ روپے (لابریری ایڈیشن)
مطبع	: روشان پرنٹرز، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

انتساب

★ ممتاز فکشن نگار محترم جناب انتظار حسین صاحب کے نام
★ عالمی شہرت یافتہ محقق، نقاد اور ماہر لسانیات محترم و مکرم
جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کے نام

اور

★ اپنے محترم و مکرم استاد جناب پروفیسر ظہور الدین صاحب کے نام
جنہیں، اس بات کا شدید دکھ ہے کہ لحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی!

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

Dr. Mushtaq Ahmed Wani

Lane No.3, House No.7

Firdousabad Sunjwan

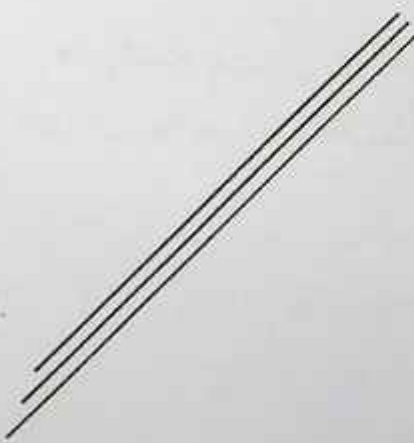
Jammu Tawi-180011

Mobile No. 09419336120 (BSNL), 07 298440737 (Aircel)

E-mail: drmushtaqahmedwani@gmail.com

اظہار تشکر

اس کتاب کی اشاعت میں
جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ
لینگویجز کا جزوی مالی تعاون شامل ہے جس
کے لیے مصنف اکیڈمی کا تہہ دل سے مشکور
و ممنون ہے۔



ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ترتیب

نمبر شمار	مضامین	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱	انتساب	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	
۲	کہانی مزاج و کہانی شناس اہل نقد و نظر کے تاثرات	----	
۳	مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے	کشمیری لال ذاکر	۷
۴	مشتاق وانی کا افسانہ اندر کی باتیں (ایک آتش فشاں)	پروفیسر قدوس جاوید	۹
۵	مشتاق احمد وانی: تخلیقی زبان اور دلکش بیانیہ کا افسانہ نگار	پروفیسر قاضی عبید اللہ بھٹائی	۱۳
۶	مشتاق احمد وانی: ایک سچے قلم کار اور تخلیقی حسیت سے مالا مال افسانہ نگار	پروفیسر مجید بیدار	۱۵
۷	مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ بصیرت "اندر کی باتیں" کے تناظر میں	پروفیسر منظر عاشق ہر گھوئی	۱۸
۸	مشتاق احمد وانی: موضوعاتی ندرت و جدت اور فنی نفاست کا افسانہ نگار	پروفیسر ابو الکلام	۲۱
۹	افسانہ نگار مشتاق احمد وانی	پروفیسر ابو الکلام قاسمی	۲۳
۱۰	'اندر کی باتیں': ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	پروفیسر محمد زماں آزاد	۲۶
۱۱	کامیاب اور منفرد افسانہ نگار: ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	پروفیسر شریف احمد قریشی	۲۸
۱۲	مشتاق احمد وانی کا ایک شاہکار افسانہ اندر کی باتیں	رفیق شاہین	۳۷
۱۳	افسانے میں ایک نیا امکان	ڈاکٹر خالد اشرف	۳۹
۱۴	دو باتیں ان افسانوں سے متعلق	توراحسنین	۴۳
۱۵	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی حق گو ادیب	روفتی جمال	۴۵

۱۶	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانہ اندر کی باتیں کا تجزیہ	ڈاکٹر عظیم راہی	۵۰
۱۷	مشتاق احمد وانی سماجی، معاشرتی اور حالات حاضرہ کے افسانہ نگار	ابوبکر عباد	۵۵
۱۸	مشتاق احمد وانی ایک مشتاق کوزہ گر	حقانی القاسی	۵۷
۱۹	افسانوں میں شعری لب و لہجہ کا ترجمان مشتاق وانی	ڈاکٹر سید افتخار جعفری	۶۱
۲۰	مشتاق احمد وانی اور ان کے افسانے	دیکھ کنول	۶۵
۲۱	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی اندر کی باتیں	دیکھ بدکی	۷۵
۲۲	اندر کی باتیں بیانیہ کا واضح اشاریہ (تعارف مطالعہ)	معین الدین عثمانی	۸۲
۲۳	مشتاق احمد وانی کے افسانے تہذیبی بحران پر تازیانے	ڈاکٹر پرویز شہر یار	۸۵
۲۴	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا جہان افسانہ	ڈاکٹر الطاف انجم	۹۵
۲۵	مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۱۰۵
۲۶	مشتاق احمد وانی کا افسانہ اندر کی باتیں (قرأت اور رد تشکیل)	ڈاکٹر رغبت شمیم ملک	۱۱۰
۲۷	ممتاز ادیب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک نظر میں	ڈاکٹر دلچیت ورما	۲۱۱



افسانے

نمبر شمار	افسانے	صفحہ نمبر
۱	جسم خور کیڑا	۱۲۰
۲	سرگوشی	۱۲۶
۳	باغی	۱۳۰
۴	قندہ	۱۳۹
۵	پانچ سال کا بن باس	۱۴۲
۶	ایک اہم سوال	۱۶۵
۷	چھپا سانپ	۱۶۸
۸	چہرہ چھپائے لوگ	۱۷۶
۹	آنکھوں کی عصمت دری	۱۷۹
۱۰	بابا کو کچھ ہو گیا ہے	۱۸۶
۱۱	باہر اور اندر کا منظر	۱۸۹
۱۲	اندر کی باتیں (۲۰۱۱ء کے نام) -	۱۹۳



کشمیری لال ذاکر (چندی گڑھ)

09356094596

مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے

جب بھی کوئی نیا تخلیق کار آسمان ادب پر ابھرتا ہے تو مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک نیا ستارہ ایک نئی روشنی اور ایک نئی بشارت لے کر آیا ہے۔ میں اس کے حق میں سلامتی کی دعا کرتا ہوں اور اس کے استقبال کے لیے اپنے گھر میں ایک نئی شمع جلاتا ہوں۔

جب کوئی ایسا واقعہ میرے وطن جموں و کشمیر میں تشکیل پاتا ہے تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک بھرے پڑے گلستان میں ایک اور گلاب کھلا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس روز جب پریم ناتھ پردیسی کا پہلا افسانہ 'ساقی' میں شائع ہوا تھا تو مجھے کتنا سکون ملا تھا۔ میں نے پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، ٹھا کر پونجھی اور ان کے بعد پشکر ناتھ، نور شاہ، نرسنگھ داس نرگس، موہن یاور، ہری سنگھ پرودیش اپنی تخلیقات لے کر میدان ادب میں آئے اور نئے گل بوٹے کھلا کر ریاست جموں و کشمیر کے ادب کو مالا مال کیا تو مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ مجھے کچھ اور لکھنے والوں کی تخلیقات کو پڑھنے کا بھی موقع ملا ہے جن میں دیپک بدکی، نرم ریاض، زلف کھوکھر اور کچھ دوسرے افسانہ نگاروں کو بھی پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ جناب مشتاق مہدی، غلام نبی شاہد، عبدالغنی شیخ، عبدالرشید لدانی، نذیر جوہر، ریاض توحیدی، فلک ریاض اور انیس عادل شامل ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ میں کچھ ذاتی اور سیاسی حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکا اور ۱۹۴۳

میں لاہور آگیا اور ترقی پسند ادیبوں کے قافلے میں شریک ہو گیا اور اس وقت کے سبھی مشہور ادبی رسائل، ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، نقوش، سویرا، میں لکھتا رہا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اپنے وطن کے ادیبوں اور فنکاروں سے جوڑے رکھا اور ایک وقت ایسا آگیا جب میرے پڑھنے والوں اور میرے ادیب دوستوں نے میرے متعلق یہ رائے قائم کر لی کہ میں اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اس سے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو جوڑنے کے لئے ایک پل کا کام کر رہا ہوں۔ میں آج جب مشتاق احمد وانی کی کہانیوں کو پڑھ رہا ہوں کہ میرے وطن کے آسمان پر ایک اور روشن ستارہ اپنی تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس کا استقبال کرتا ہوں اور اس کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔

اس سے پہلے مجھے وانی کی کتاب 'اردو ادب میں تانیثیت' کو بھی پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا تحقیقی کام ہے۔ اس کے لئے اسے مبارک پیش کرتا ہوں۔
خدا کرے وہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنی تخلیقات سے مالا مال کرتا رہے۔



پروفیسر قدوس جاوید

(سابق صدر شعبہ اردو سینٹرل یونیورسٹی، کشمیر)

09419010472

مشتاق وانی کا افسانہ ”اندر کی باتیں“

(ایک آتش فشاں)

معاصر اردو ادب میں مشتاق وانی ایک مانوس قلم کار کا نام ہے۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کو یکساں طور پر ایک معیار کے ساتھ برتنا آسان نہیں۔ لیکن مشتاق وانی ایسا کر گزرتے ہیں۔ اس سے اُن کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے اُس کی مفصل تصنیف اُن کے وسیع و عمیق مبلغ علم کا تازہ ثبوت ہے۔ فکشن کی تنقید اُن کی تنقیدی سرگرمیوں کا نمایاں پہلو تو ہے ہی، لیکن ساتھ ہی ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت سے بھی مشتاق وانی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اُن کے کئی افسانے ہیں جو انہیں معاصر افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ دلوانے کی ضمانت ہیں۔ لیکن ان کا افسانہ ”اندر کی باتیں“ کئی اعتبار سے ایک عمدہ مابعد جدید افسانہ کہلانے کا سزاوارث ثابت ہوتا ہے۔

مابعد جدید افسانہ میں بنیادی فکر، خیال یا موضوع، افسانہ کے مرکز میں پاؤں تو جمائے رکھتا ہے کہ یہ افسانے کا فنی تقاضا ہے لیکن ساتھ ہی موضوع کے دائرے اور لکیریں، تجربات و محسوسات کے طور پر پورے افسانہ کے اندر اور باہر حاشیوں پر بھی پھیلے ہوتے ہیں اور آخر کار افسانہ کو ایسے موڑ پر پہنچا دیتے ہیں جس کے آگے کیفیت و تاثر کی ان گنت

صورتیں بنتی اور مٹی رہتی ہیں۔ قاری اس موڑ پر پہنچ کر کیفیت و تاثر کی کس راہ پر گامزن ہوگا اس کا فیصلہ کرنے کا مجاز قاری خود ہوتا ہے۔

افسانہ ”اندرو کی باتیں“ ملک کے تعلیمی نظام میں پھیلی بدعنوانی کو بے نقاب کرتا ہے، مفاد پرست سلیکشن کمیٹیوں کے ارکان اور سینئر پروفیسروں کی ضمیر فروشیاں کا پردہ چاک کرتا ہے اور ساتھ ہی علم و دانش کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے جینیون اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل اُمیدواروں کے ساتھ روارکھی جانے والی بے انصافیوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام میں چترنجن باسوجیسے پروفیسروں کی تعداد دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ایسے پروفیسران نہ صرف خود توڑ کر کے پروفیسر جیسے مقدس منصب پر قابض ہو جاتے ہیں بلکہ دولت، عورت اور شراب کی ہوس میں ناعاقبت اندیش، نام نہاد ممتحنوں (Experts) کے ساتھ ساز باز کر کے نالائق اور نا اہل امیدواروں کو منتخب کروانے میں کامیاب بھی جاتے ہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار کمل کانت ایک استعارہ ہے۔ اُن سینکڑوں ہزاروں غیر معمولی دانشور اساتذہ کا جنہیں یونیورسٹیوں میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ جبکہ خیالورام اُن اساتذہ کی نمائندگی کرتا ہے جو علم و آگہی کے اعتبار سے تو کھوکھلے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں (یونیورسٹیوں) میں من چاہا منصب حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ سارے کے سارے ممتحن (Experts) بے ایمان اور ضمیر فروش ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں علم دوست اور صلاحیتوں کے قدردان پروفیسروں کی کمی نہیں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ جب سلیکشن کمیٹی میں حق بہ حق دار رسید کا مرحلہ آتا ہے تو وہ احتجاج یا کم از کم ناراضگی کا اظہار کرنے کی بھی جسارت نہیں کر پاتے ہیں۔ چترنجن باسوجب انٹرویو کے ایک ایکسپرٹ سے کمل کانت کو رنجیکٹ اور خیالورام کو سلیکٹ کرنے کی بات کرتا ہے تو پروفیسر کلدیپ سنگھ تلملا اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

”باؤ صاحب! مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا مزاج رکھتے ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی کہنے پر مجبور کریں گے۔ میں جہاں کہیں بھی آج تک

سلیکشن کمیٹی میں گیا ہوں تو میں نے حقدار کو اس کا حق دلایا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ خیالورام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور کمال کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اس پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ کمال کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، تاریخ کے دقیق موضوعات پر اُس کی تحقیق نے نئی جہات مرتب کی ہیں۔ اُس کی زبان اُس کے موضوعات اور اُس کی علمی بصیرت کا باسوا صاحب میں بہت قائل ہوں۔ یہ وہی کمال کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کنیڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد و تحسین وصول کرتے ہیں۔“

لیکن جب انٹرویو میں کمال کانے سے بے سرپیر کے سوالات کئے جاتے ہیں اور انہیں رنجشکٹ کر دیا جاتا ہے تو پروفیسر کلدیپ سنگھ کو اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے خیالورام جیسے لوگوں میں وہ کونسی خوبیاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر انہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر شپ مل جاتی ہے اس کا اندازہ چترنجن باسو کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جو وہ نریش رانا صاحب کے سامنے خیالورام کی صفات کے بارے میں ادا کرتا ہے:-

”نریش رانا صاحب میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پچھ کرنے تک وہ کون سا ایسا کام ہے جو خیالورام نے نہیں کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائے میں اس کا خیال نہ رکھوں تو کس کارکھوں اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے بلکہ اُس نے تو اپنی جمع پونجی بھی میرے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے اب آپ ہی کہئے کیسے انکار کروں۔“

مشتاق وانی نے افسانہ ”اندر کی باتیں“ میں یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ صارفیتی تہذیب کے زیر اثر چند لوگوں نے ”پروفیسری“ کو بھی ایک منفعت بخش کاروبار بنا لیا ہے۔ کئی اداروں میں ارباب حل و عقد کو اس کا علم بھی ہوتا ہے پھر بھی وہ آنکھیں بند کئے رہتے ہیں۔ اس سچائی کی جانب نریش رانا کی زبانی ان الفاظ میں اُلٹگی اٹھائی گئی ہے۔

”کمال کانت؟ جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیاں یا صابن کی ٹکڑی مفت میں

نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت، اور قابلیت کی بنیاد پہ مل جاتی! تجھے پتا ہونا چاہئے دو لاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔“

مشتاق وانی نے بڑی جرات مندی سے کام لیتے ہوئے دارالعلوم کے سربراہوں پر بھی طنز کیا ہے۔ مکمل کانت نریش رانا کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ

کی سی ہوتی ہے وہ چاہئے تو چھوٹے ملازموں سے لے کر بڑے ملازموں تک سب سے رات بھر کھڑے کھڑے کام لے سکتا ہے اور چاہئے تو دن کو انہیں آرام کروا سکتا ہے۔

دارالعلوم کے کسی انٹرویو میں اگر وہ اڑ جائے تو مستحق اُمیدوار کو حق دلانے بغیر نہیں رہتا۔ اس

صورت میں منتری سے لے کر پردھان منتری تک کی تمام سفارشیوں دارالعلوم کے سر

پرست اعلیٰ کی رہائش گاہ کی دیواروں سے سرکراتی ہوئی اس کے کوڑے دان میں منہ کے

بل گر جاتی ہیں لیکن اس بار اس کی حیثیت ایک ڈراما میں سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی، یوں

معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے چترنجن باسو نے اُسے پہلے ہی گدگدی کر کے ہنسایا ہو۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ملک بھی گلوبلائزیشن اور صارفیتی تہذیب

(Consumer Culture) کی زد میں ہے۔ ہر شخص کسی بھی معاملے کو نفع اور نقصان کے

زاویے سے شکم کی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ انصاف پسندی پر ہوس پرستی

غالب آتی جا رہی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سیاست ہو یا ثقافت، اقتصادیات ہو یا تعلیم کا

میدان، ہر جگہ سطحیت اور میڈیوکریسی کا دور دورہ بڑھتا ہی جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود

ہمارے معاشرے میں ”خدا پرستی“ باقی ہے۔ یہ ایمان کہ خدا بہر حال بندوں کو اس کے

اعمال کی سزایا جزا ضروری دیتا ہے۔ ابھی بھی ہمارے اخلاقی نظام کا لازمی جزو ہے۔ مشتاق

وانی کے افسانہ ”اندر کی باتیں“ کا عبرتناک اختتامیہ اسی ایمانی شان و شکوہ کا اشاریہ ہے۔

”جب مکمل کانت اپنے گھر پر پہنچا تو اس نے ایک مخصوص وقت پر ایکلیس (۲۱)

دن تک جاپ کیا۔ ایک وقت کا کھانا کھایا۔ گھر کے گوشہ تنہائی میں نہ جانے وہ بھگوان سے

کیا کچھ مانگتا رہا۔ بالآخر اس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو بھگوان کے دربار میں شرف

قبولیت حاصل ہو گیا۔ ادھر مکمل کانت کا جاپ پورا ہوا۔ ادھر چترنجن باسو کے ہاتھوں اور

پیروں میں بے حسی پیدا ہو گئی جو مسلسل بڑھتی چلی گئی اور پھر جب وہ شہر کے مشہور ماہر امراض ڈاکٹر یوگیشور کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اسے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

”باسو صاحب! آپ کے جسم میں کوڑھ کی بیماری نے ڈیرہ ڈال دیا ہے“

اس افسانے کی ساخت ایسی ہے کہ جو لوگ مشتاق وانی کی شخصیت اور صلاحیتوں سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسرے سینکڑوں لوگوں کی طرح اُن کے ساتھ بھی کیسی کیسی بے انصافیاں ہوئی ہیں۔ تو عین ممکن ہے کہ ان کے اس افسانے کے بیانیہ کو ”جگ بیٹی“ سے زیادہ ”آپ بیٹی“ تصور کیا جائے۔

مشتاق وانی کو افسانہ بننے کا فن آتا ہے۔ بیانیہ (Narration) کو برتنا جانتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کہاں کیا نہیں لکھنا چاہئے۔ افسانہ ”اندر کی باتیں“ محض افسانہ نگار کے داخلی جذبات و احساسات کا اظہار ہی نہیں۔ مشتاق وانی کے وجود کے اندر کا آتش فشاں ہے جو پھوٹ کر افسانے کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ ہمارے ادب کو، معاشرے کو ایسے ادب کی ضرورت ہے۔



پروفیسر قاضی عبدالرحمن ہاشمی، دہلی

09990893596

تخلیقی زبان اور دلکش بیانیہ کا افسانہ نگار: مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ہمارے ان نوجوان ادیبوں میں ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور معیاری تحقیق و تنقید کی بدولت دنیائے ادب میں جموں و کشمیر کا نام روشن کیا ہے۔ وہ ایک تعمیری ذہن کے مالک اور مقصد آشنا تخلیق کار ہیں جو اپنے متعدد افسانوں کے ذریعہ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ افسانہ نگاری نہ صرف ایک اہم سماجی ذمہ داری اور اخلاقی فریضہ ہے بلکہ یہ ہماری معاشرتی زندگی میں پھیلے ہوئے تمام تر شر و فساد، مکر و فریب، ظلم و نا انصافی اور جہل و تنگ نظری کے عفریت سے مسلسل برسر پیکار رہنے کا بھی ایک موثر وسیلہ ہے۔

وانی کے افسانے ان کی ذات سے شروع ہو کر انہیں پر ختم ہونے یا ان کی نجی زندگی کی محرومیوں اور نا کامیوں کی روئداد ہونے کے بجائے اپنی ایک عمومی اور آفاقی جہت رکھتے ہیں جن میں پیش کردہ دکھ درد سے اکثر قاری اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب ان کہانیوں کی موثر اور پر قوت تخلیقی زبان اور دلکش بیانیہ ہے۔

وانی نے اپنے ادبی مضامین خصوصاً اپنی تصنیف 'اردو ادب میں تانیثیت' کے ذریعہ ادبی، سماجی اور فلسفیانہ مسائل، خصوصاً عہد جدید میں خواتین کی ذہنی آزادی اور ان کو درپیش گونا گوں سیاسی، سماجی اور وجودی مسائل کو جس طرح سمجھا اور سمجھایا ہے وہ بھی نہایت قابل ستائش ہے۔ مجھے امید ہے کہ وانی کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'اندر کی باتیں' اپنے گہرے سماجی سروکار، بصیرت اور دافر مشاہدے کی بدولت قارئین کے ذہنوں پر دیر پا نقش چھوڑے گا۔



پروفیسر مجید بیدار

(سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد)

09441097072

مشتاق احمدوانی

ایک سچے قلم کار اور تخلیقی حیثیت سے مالا مال افسانہ نگار

اظہار کی حقیقتیں عصر حاضر کا تقاضا ہے اور اس تقاضے کو محسوس کرتے ہوئے تخلیق کاروں نے حقیقت پسندی اور اس سے آگے کی باتوں کو تخلیقی حیثیت کا وسیلہ بنایا ہے۔ اردو کی شعری دنیا میں غزل کو جس طرح کلی حیثیت حاصل ہے اسی طرح نثر میں افسانے کی صنف کو عالمی سطح پر سند کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ اردو افسانہ اور اس کے قلم کاروں نے زندگی کی ہر جہت کو تخلیق کا سہارا بنا کر ایسی دنیا آباد کی کہ جس پر بلاشبہ تخلیقیت کو بھی ناز ہو سکتا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو افسانے کے بدلتے ہوئے تیور نے دنیا میں موجود نیرنگی کے پس پردہ استحصال اور گھٹناؤنی سازشوں کو بے نقاب کرنا شروع کیا۔ ہندوستان کی سرزمین سے اردو افسانے کی نمائندگی کرنے والے چند اہم تخلیق کاروں میں ڈاکٹر مشتاق احمدوانی کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر کی سرزمین سے آواز بلند کرتے ہوئے شعور کے کرب ہی نہیں بلکہ ذات کے کرب کو بھی اپنے افسانوں کا وسیلہ بنایا۔ ڈاکٹر مشتاق احمدوانی ایک سچے قلم کار اور تخلیقی حیثیت سے مالا مال ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے دنیا کی کڑوی حقیقتوں کی پیش کشی پر توجہ دی۔ وہ بیک وقت تخلیقی نثر کے قلم کار ہی نہیں بلکہ تحقیق

و تنقید کے علمبردار بھی ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'اندر کی باتیں' منظر عام پر آ رہا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد دانی اردو کے ان چند اہم افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے انسان کی ذات کو دروں بینی اور بیروں بینی حیثیت سے دیکھا ہے۔ تصوف کی زبان میں اس عمل کو ظاہر و باطن کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کی افسانوں کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ انسانی ضمیر کو گھنچھوڑنے والی تخلیقات کے ذریعہ کڑوی اور تلخ حقیقتوں کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ فطری طور پر کچھ کر یہی حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار پر قلم کو روک لگانا ضروری ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد دانی تہذیبی و اخلاقی اقدار کی شکست سے برا فرودختہ ہیں اور ایسا برا فرودختہ تخلیق کار ہی اپنا مشہور افسانہ 'چھپا سانپ' لکھ سکتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے مختلف رسائل و جرائد میں نظر نواز ہوتے رہے۔ اپنے افسانوی مجموعے 'اندر کی باتیں' کی اشاعت سے قبل ہی انہوں نے اس کتاب میں شامل بارہ افسانوں کے ۶ مسودات بھی روانہ کیے ان کے طرز تحریر اور فکر کی بلندی سے بلاشبہ اردو کا ہر قاری متاثر ہے۔ افسانے کو بیان کرنا اور اس کے توسط سے کہانی کو کشمکش سے ہم آہنگ کر کے انجام کی طرف لے جانا ان کے افسانوں کی بہت بڑی خوبی ہے۔ فطری آغاز اور بے ساختہ انجام ان کے افسانوں کی بہت بڑی خوبی ہے اور وہ اپنے افسانوں میں عصر حاضر کے مسائل کو پیش کرنے اور بگڑتے ہوئے سماج کی بے راہ روی کو نمایاں کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ 'اندر کی باتیں' جیسے افسانوی مجموعے میں شامل تمام بارہ افسانوں کا محاکمہ کیا جائے اور ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کی افسانوی خصوصیت کو نمائندگی دی جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے کہانی کو تلاش کرنا اور کرداروں کو منضبط رویے کے توسط سے افسانے میں تخلیقیت کو نمایاں کرنا ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کو خوب آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مشاہدے کی قوت بہت تیز ہے۔ حساس دل کے مالک ہونے کی وجہ سے ان کی تحریریں حقائق سے مالا مال اور اظہار کی خوبیوں سے علاقہ رکھتی ہیں۔ ان کے فن کی یہ خوبی بھی اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے چند ایک افسانوں کو چھوڑ کر اکثر افسانے انسانی فطرت کے عین مطابق

لکھے ہیں۔ ان کے افسانے اس قابل ہیں کہ انہیں کئی بار پڑھا جاسکے۔ تخلیقی حیثیت کا نادر نمونہ ان کی تحریروں کا وصف ہے۔ وہ ہمیشہ جدت اور ندرت کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں نئی آگہی اور عصری حیثیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سماج کے دیگر موضوعات کی طرف توجہ دیتے ہوئے اگر وہ جنسی بے راہ روی کے موضوع سے فرار اختیار کریں تو بلاشبہ ان کی تحریر کا جادو اردو دنیا کو اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔ بلاشبہ جنس بھی زندگی کا ایک رویہ ہے لیکن کسی بھی رویے کو ذات اور شخصیت پر مسلط کر لینا مناسب نہیں۔ توازن ہی زندگی کا بہترین وصف ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی عصری حقیقتوں کو بیان کرنے کے دوران سماج اور معاشرے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی فطری خصوصیت کو بھی ملحوظ رکھیں۔ غرض کشمیر کی سرزمین سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تیسرے افسانوی مجموعے 'اندہر کی باتیں' کی اشاعت پر دلی مبارک باد دیتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ فہم و فراست کے نازک موتیوں کو اپنے اسلوب میں چھلکاتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے افسانہ نگاری کے ذریعے اپنی تخلیقی حیثیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ توقع ہے ان کی تخلیقی کاوشوں کو اردو داں طبقہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گا اور ان کے افسانے ہر ہندوستانی کے دل کی آواز بن کر سماج اور معاشرے میں تغیر و تبدل کا وسیلہ بن جائیں گے۔ میری نیک تمناؤں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانہ اور ان کی تخلیقی حیثیت کے ساتھ شامل ہیں۔ توقع ہے کہ اردو داں طبقہ حقیقت پسندی کے اس اظہار پر ضرور توجہ دے گا۔



پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

09430966156

مشاق احمدوانی کی فنکارانہ بصیرت

’اندر کی باتیں‘ کے تناظر میں

ڈاکٹر مشاق احمدوانی پڑھے لکھے اور ذی فہم فنکار ہیں۔ مشاق احمدوانی نے تاریخ کے سبکیٹ کے ایک انٹرویو کی تفصیل بیان کی ہے کہ چترنجن باسوجیسا انٹرویو بورڈ کا ممبر خیا لورام کو اسسٹنٹ پروفیسر بنانا چاہتا ہے جس کے بارے میں وہ خود بتاتا ہے۔

”میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیرنے تک کون سا ایسا کام ہے جو خیا لورام نے نہیں کیا ہے اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے بلکہ اس نے تو اپنی جمع پونجی بھی میرے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دی ہے۔ میں نے پوچھا کتنی جمع پونجی؟

چترنجن باسو نے اپنے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں میرے سامنے کھڑی کر دیں۔ ”پانچ لاکھ کے اس نوکر نما کنڈیڈیٹ کی بابت ایکسپریٹ سے چترنجن باسو سفارش اس طرح سے کرتا ہے:

”اس کا انتخاب ہونا چاہئے۔ یہ ہسٹری میں ایم فل، پی ایچ ڈی ہے۔ نہایت شریف، دیانتدار اور محنتی ہے۔ اس لئے آپ نے اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھا ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام،

شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔“

خیالورام کے مقابلے میں مکمل کانت بھی ایک کنڈیڈٹ ہے جس کے بارے میں سلیکشن کمیٹی کے ایک دوسرے ممبر اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

”آپ خیالورام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور مکمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اس پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مکمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاریخ کے دقیق موضوعات پر اس کی تحقیق نے کئی جہات مرتب کی ہیں۔ یہ وہی مکمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کنیڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد تحسین وصول کرتے ہیں۔“

چترنجن باسو پیر پکڑ لیتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں کہ خیالورام کو ہی ترجیح دیں۔ تیسرے ممبر کو بھی وہ اسی طرح راضی کر لیتے ہیں۔ اور آخر کار انٹرویو کے لئے ماہرین تاریخ کے روبرو مکمل کانت جب ہوتا ہے تو اس سے سوالات کئے جاتے ہیں:

(۱) ”حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا سائز کیا تھا یعنی اس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کتنی تھی؟

(۲) دنیا میں پہلے مرغی آئی یا انڈا؟

(۳) شاہجہاں اور متا ز بیگم کی قبروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

(۴) حشر الارض میں کون سا کیڑا سب سے پہلے گرمی کے موسم میں زمین کے اندر سے باہر آتا ہے اور کون سا کیڑا سردی کے موسم میں سب سے پہلے زمین کے اندر چلا جاتا ہے؟“

ظاہر ہے مکمل کانت کسی سوال کا جواب نہیں دیتا اور خیالورام کو ملازمت مل جاتی ہے۔

آج کے گلوبلائزیشن کے عہد میں افکار و نظریات میں انقلاب برپا ہے۔ لیکن تعلیمی قدر شناسی میں زیت کے اصول مرتب کرتے وقت استحصال، چا پنوسی اور روپے کی قدر و قیمت کو ہی فوقیت دی جاتی ہے جس سے شعور آگئی اور بصیرت و بصارت مجروح ہو رہی ہے۔ اس سازشی المیہ سے جہاں سوچ کے دائرے سمٹتے جا رہے ہیں وہیں بغاوت کی چنگاری کو ہوا مل رہی ہے۔ مکمل کانت جیسے ہونہار مایوسی کے عالم میں یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ حالانکہ اس افسانہ میں ایسا کچھ ہوتے ہوئے رہ جاتا ہے۔

مشتاق احمد وانی نے جس آئینہ کا عکس پیش کیا ہے اس میں سماجی اور معاشرتی نظریات کی سچائی برعکس ہے۔ حقیقت کی اہمیت وہی ہے جو اس افسانہ میں ہے جو اس افسانہ میں ہے۔ حاشیے پر کھڑے لوگ محض تماشا بین ہیں۔ دائرے میں محدود وقت مصلح نہیں ہے۔ صحت مند عمل سے کوئی آشنا نہیں ہے۔ چہرے پر اضطراب زمان و مکان کے گزرتے لمحے کی نا انصافی کو نشان زد کرتا ہے لیکن معنویت عصری تصویر میں گم ہے۔ عدم مساوات، ظلم و جبر، تعصب پرستی، بے ایمانی، جنگ نظری اور جنگ ذہنی کی تاریکی ہر زمانے میں کم و بیش رہی ہے لیکن اکیسویں صدی کے گزرتے ماہ و سال میں یہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ تخلیقی شناخت میں صرف کشمکش ہے، حال کے اندیشے میں کک اور کک ہے۔ ایسے میں سچ بستہ سماج کی کجروی اور زہرنا کی دیر پا ثابت ہو رہی ہے جس کی جڑیں بدلتے نقشے کی نقاب کشائی نہیں کرتیں بلکہ استحصال کے محور کی آئینہ دار ہیں۔ مکمل کانت جیسے تاریخ سے واقفیت رکھنے والے فنکار کو دم توڑتی انسانیت کے گھناؤنے پن سے بکھراؤ ملتا ہے۔ اسے نا انصافی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ پاؤں پھیلاتی تعلیمی برائیوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جاتا ہے اور سفید پوش طبقہ کے چلن پر کڑھتا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو جھنجھوڑنے کا شعور رکھتا ہے۔ مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ بصیرت اور موضوع کے تنوع کی وجہ سے، جذبات و احساسات کو اعمال کے منفرد انداز اور وژن کی کرشمہ سازی کی بنا پر یہ افسانہ الگ جہتیں رکھتا ہے، عصری حسیت کی نباضی کرتا ہے۔ تہہ بہ تہہ رمزیت و ایمائیت کے گراف تک لے جاتا ہے اور بے کردار اجتماعی زندگی کو پہچان عطا کرتا ہے۔ عصری مسئلے کی اس لہر میں دائرے کو محیط کرنے کی قوت ہے۔ جذبے کی زبان میں لکھی یہ کہانی درد سے بھری ہوئی ہے۔



پروفیسر ابوالکلام

صدر شعبہ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

09866365003

مشاق احمدوانی

موضوعاتی ندرت و جدت اور فنی نفاست کا افسانہ نگار

مشاق احمدوانی ۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو ریاست جموں و کشمیر، ضلع ڈوڈہ، بہوتہ گاؤں کے سروال محلے میں پیدا ہوئے۔ ادبی دنیا میں انہیں ایک اہم افسانہ نگار، محقق اور ناقد کی حیثیت سے جانا و پہچانا جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور معاشرے کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ انہیں ایک ادبی پہچان عطا کرتے ہیں۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کے مختلف موضوعات پر ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جنہیں جموں و کشمیر، مہاراشٹر اور اتر پردیش کی اکادمیوں سے اعزازات بھی حاصل ہوئے ہیں۔ جموں یونیورسٹی نے 'مشاق احمدوانی بحیثیت افسانہ نگار کے موضوع پر ایم فل کی ڈگری تفویض کی ہے۔

مشاق احمدوانی ایک حساس طبیعت اور ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ اردو افسانے کی شاندار روایت کو آگے بڑھانے میں ان کی افسانہ نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ زیر نظر افسانوی مجموعے سے قبل دو اور مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا یہ تیسرا مجموعہ 'اندر کی باتیں' جملہ بارہ افسانوں پر محیط ہے، جن میں 'اندر کی باتیں'، 'جسم خور کیز'، 'باغی'، 'چھپا سانپ'، 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے'، 'ایک اہم سوال'، 'فتنہ'، 'چہرہ چھپائے لوگ'، 'باہر اور اندر کا

منظر، پانچ سال کا بن باس، آنکھوں کی عصمت دری، سرگوشی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

افسانوی مجموعہ اندر کی باتیں میں شامل کبھی افسانے سماج کے مختلف مسائل کو

اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات میں ندرت و جدت کا پہلو نمایاں

ہے۔ چھوٹے اور اچھوتے موضوعات کو افسانوی رنگ دینا اور قاری تک اپنے خیالات و

احساسات کو پہچانا مشتاق احمد وانی کی خاص بات ہے۔ ان کے افسانے اندر کی باتیں میں

سماج میں موجود کرپشن، رشوت خوری، سیاسی چال بازیوں اور ایک بے روزگار نوجوان کی

کیفیت اور اس میں جنم لینے والے برے خیالات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

’جسم خور کیزا‘ میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی جسم کی اصلیت اور معاشرے میں اقدار کی

پامالی کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ افسانہ ’فتنہ‘ میں سماج کے افراد کے احمقانہ برتاؤ پر طنز ہے۔

افسانہ ’سرگوشی‘ میں نئی نسل کی ناپائیدار محبت اور مکرو فریب کو موضوع بنایا ہے۔ بابا کو کچھ ہو گیا

ہے افسانے میں دھرم کے ٹھیکیداروں کی اصلیت کو واضح کیا ہے۔ ’چھپا سانپ‘ میں ایک

عورت کی بے بسی اور ایک مرد کی وحشیانہ حرکت کو دکھانے کی کوشش کی ہے، جس میں ایک

عورت کا اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہونے اور سماجی قدر ورشتے کی پامالی کو موضوع بنایا ہے۔

مشتاق احمد وانی کے افسانے اپنے فن اور موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ ان

کے افسانوں کے پلاٹ سادہ ہیں۔ موضوعات عام اور روزمرہ کی زندگی سے اخذ کئے گئے

ہیں۔ ان عام فہم موضوعات میں افسانویت پیدا کرنا اور انہیں فن پارے کا روپ دینا ایک

ماہر فنکار کا ہی کام ہوتا ہے۔ جس میں مشتاق احمد وانی کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے

منتخب کردہ موضوعات عام طور پر بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان موضوعات

کو لوگوں نے غیر ضروری سمجھا۔ مشتاق احمد وانی نے ان غیر ضروری موضوعات میں بھی

ضرورت کی چیز ڈھونڈ نکالی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سماج کی برائیاں دور کرنے

اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کے خواہاں ہیں۔ وہ معاشرے میں انسان دوستی، اخوت،

مساوات، اقدار کی پاسداری، قومی یکجہتی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے

بیشتر افسانوں کے موضوعات کی بنیاد انہیں مقاصد پر منحصر ہے۔

مشتاق احمد دانی کے یہاں افسانوں میں کرداروں کا انتخاب بھی مناسب و متوازن دکھائی دیتا ہے۔ وہ واقعے کے عین مطابق کردار کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے کردار مختلف سماجی، تہذیبی اور مذہبی گروپ سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ سبھی کردار اپنی خصوصیات کے ساتھ افسانے میں داخل ہوتے ہیں اور افسانوی فضا پر چھا جاتے ہیں۔ افسانے میں واقعات کے زیر سایہ رونما ہونے والے مناظر ایک خاص فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کہانی پن پایا جاتا ہے۔ افسانے کے واقعات کی تفہیم میں قاری کو زیادہ الجھنا نہیں پڑتا، قاری پڑھتا جاتا ہے اور واقعات منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ قاری کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں افسانہ نگار بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔

مشتاق احمد دانی کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے لیکن کہیں کہیں پر ایسے اور بہترین جملوں میں ثقیل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، جو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کرداروں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی سیاق میں زبان کا استعمال کیا ہے۔ مشتاق احمد دانی کے افسانوں میں سماج کی اصلاح و فلاح کا پہلو مضمر ہے۔ وہ قوم و ملت کی ترقی، قومی یکجہتی، باہمی مساوات اور اخوت کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ مشتاق احمد دانی نے اپنے افسانوں میں ان سبھی موضوعات کو سمویا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ سماج اور معاشرے میں تبدیلی کا باعث ہوگا نیز جسے ادبی سماجیات کے تفہیمی عمل کے لئے آلہ کار کے طور پر لیا جائے گا۔ میری نیک خواہشات اور تمنائیں۔



پروفیسر ابوالکلام قاسمی
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

/09456241142

افسانہ نگار مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ادب کے ایک سنجیدہ قاری اور ادیب ہیں۔ انہوں نے یوں تو متعدد عمدہ افسانے بھی لکھے ہیں مگر اپنا زیادہ گہرا نقش تنقید نگاری میں قائم کیا ہے۔ یہ اتفاق بہت ہی عام ہے کہ ایک سے زیادہ اصناف ادب سے سروکار رکھنے والے ادیب کسی خاص صنف کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کر پاتے۔ تاہم مشتاق احمد وانی نے افسانوی تخلیقات میں اپنے تنقیدی شعور کو بھی استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے وہ تنقید میں اپنے ناقدانہ شعور کو رو بہ عمل لاتے ہیں اور افسانہ نگاری میں افسانے کے فنی لوازم کا خیال رکھتے ہوئے اپنے اسی شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب جبکہ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ متعدد افسانوں کی تخلیق کے عمل سے گزرنے کے بعد افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی کارکردگی پر راقم الحروف ایک نگاہ ڈالنا لازمی سمجھتا ہے۔ اس مجموعہ کا نام 'اندر کی باتیں' رکھا گیا ہے جو مصنف کے ایک افسانے کا عنوان بھی ہے۔ اس عنوان میں اگر کسی قدر سنسنی خیزی کا عنصر شامل ہے تو اس سے بدگمان ہونے کا انہیں اس لئے اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے مراد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ واقعات کی ظاہری سطح اور فنی رکھ رکھاؤ کے اندر تحت البیان اور زیریں لہر کے طور پر مصنف مادی حقائق کے بجائے نفسیاتی، اقداری اور

ذہنی کیفیات کو جس طرح نمایاں کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال قابل داد ہے۔ مشتاق احمد دوانی کے افسانوں کا بنیادی موضوع قدروں کا زوال ہے۔ وہ نئے نئے انداز اور نئے واقعات اور صورت حال کی مدد سے اس مسئلے کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اگر ہم سہل پسندانہ انداز میں کوئی نام دینے کی کوشش کریں تو آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ افسانے کے اسلوب اور ہیئت میں زیادہ تجربہ کرنے کے قائل نہیں۔ مگر فکشن کی روایت پر ان کی گرفت مضبوط ہے اس لئے بیانیہ پر بھی ان کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔

فکشن کی شعریات میں اس کے فنی لوازم، زبان و بیان، تکنیک اور اوّلین مباحث کو نئے سیاق و سباق میں استعمال کی طرف جو توجہ ادھر مرکوز کی جانے لگی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی ان مسائل سے بخوبی واقف ہیں مگر اس ضمن میں مسائل و مباحث سے واقفیت سے زیادہ ان کے لئے فکشن میں کارآمد طریقے پر استعمال کرنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر دوانی بیانیہ کی نئی روایت کو بھی فنی سطح پر استعمال کرنے کی کوشش کریں اور رواداری کی نوعیت اور زمانی ساخت کو بھی مختلف انداز و اسلوب سے بھی پیش کرنے کی طرف توجہ مبذول کریں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی اگر اپنے افسانوں کی زبان کو نسبتاً زیادہ تہہ دار اور کرداروں کو ہمہ جہت بنانے پر توجہ دیں تو ان کے افسانوں میں مزید چار چاند لگ سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی کیا کم ہے کہ ان کو افسانے کے فنی تقاضوں کا بھرپور احساس ہے۔ وہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اپنے اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں اور کرداروں کی نفسیات میں بھی گہرائی تک اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی تکنیک البتہ روایتی طرز سے مختلف نہیں ہوتی تاہم اس بات کے سبب ان کے فن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ اگر اپنی افسانہ نگاری کے سفر میں اپنے تجربات اور مشاہدات کو زیادہ رہنما بنائیں تو یہی ان کی سب سے بڑی طاقت ثابت ہو سکتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کا افسانوی مجموعہ اشاعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اردو کے افسانوی منظر نامے میں ان کا ورود ایک فال نیک قرار دیا جاسکتا ہے۔



پروفیسر محمد زماں آزرہ
(سری نگر کشمیر)

09419007939

’اندر کی باتیں‘ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک زمانے سے کہانیاں لکھ رہے ہیں ان کے کئی مجموعے بھی شائع کر کے اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں مہاراشٹر اور دوسری ریاستوں نے انعامات سے بھی نوازا ہے۔ اردو کے ادبی حلقوں میں ان کی اور ان کی کہانیوں کی پذیرائی برابر ہوتی رہی ہے۔ ایک بات ان کی کہانیوں میں بطور خاص محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ ایک ایسی تلمیح ہے جس کو الفاظ کے لباس میں مستور رکھنے کے باوجود کوئی بھی محسوس کر سکتا ہے البتہ جو لوگ ان کو قریب سے جانتے ہیں ان سے یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ مشتاق احمد وانی شہر سے بہت دور ایک دیہات میں رہتے ہیں پٹیشے سے یہ استاد ضرور ہیں مگر لکھنا پڑھنا انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ غالباً اسی لئے ان کے کارناموں پر جموں یونیورسٹی سے ایم فل ڈگری کے لئے ایک تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے۔ ان کا دائرہ کار یونیورسٹی اور کالجوں کے غیر علمی مباحث سے کافی الگ تھلگ رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی ادبی کاوشیں جو سامنے آئی ہیں۔ ان کی تخلیق، ترتیب اور تالیف میں ان کو کتنی مشکلیں پیش آئی ہوں گی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کتنے مآخذ ان کی کوششوں کے باوجود ان سے بہت دور ہے ہوں گے مگر یہ کیا کم ہے کہ دور دیہات میں بیٹھ کر اسکول کے ماحول میں کام کر کے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے رابطے میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنی

ایک شناخت بنائی ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی کہانیوں کو فن اور اسلوب کے لحاظ سے نہیں دیکھنا چاہئے جس نظر سے ہم آج ہم رنگ وے کی کہانیوں کو یا اردو میں منٹو اور کرشن چندر وغیرہ کی کہانیوں کو دیکھتے ہیں کہ کیونکہ جس ماحول کو مشتاق احمد دانی نے دیکھا، برتا اور سہا ہے ان لوگوں نے ایسے ماحول کو صرف سوچا ہے۔ مشتاق احمد دانی کے ماحول کے تناظر میں دیکھیں تو ان کے افسانے اردو ادب میں اہم ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا تازہ مجموعہ اُندر کی باتیں مقبول ہوگا اور اس کی پذیرائی ہوگی۔ میں دعا گو ہوں کہ مشتاق احمد دانی صاحب کی کوششیں ایسا رنگ لائیں کہ خود مشتاق احمد دانی کی زندگی میں نئے رنگ بھر جائیں۔



پروفیسر شریف احمد قریشی (رام پور)

09027257007

ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی

کامیاب اور منفرد افسانہ نگار

ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کا نام ادبی حلقوں میں غیر معروف نہیں ہے۔ وہ بیک وقت محقق بھی ہیں اور نقاد بھی، مبصر بھی ہیں اور مفکر بھی اور ایک کامیاب منفرد و معتبر افسانہ نگار بھی ہیں۔ وہ سابقہ کئی دہائیوں سے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کے بے شمار تحقیقی، تنقیدی و تجزیاتی مقالات و مضامین اور افسانے موقر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کی متعدد گراں مایہ نگارشات زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قبولِ خاص و عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری کے لئے قلم بند کیا گیا اُن کا تحقیقی مقالہ ”تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران“ اور ڈی۔ لیٹ۔ ڈگری کے لئے سپرِ قلم کیا گیا اُن کا تحقیقی مقالہ ”اردو ادب میں تانیثیت“ کی حیثیت نہ صرف دستاویزی ہے بلکہ تاریخ ساز بھی ہے۔ اُن کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعوں آئینہ درآئینہ، اعتبار و معیار اور شعور بصیرت کی بھی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ”ہزاروں غم“ 2001ء میں منظرِ عام پر آیا اور دوسرا مجموعہ ”میٹھا زہر“ 2008ء میں طبع ہوا۔ اُن کے تیسرے افسانوی مجموعہ کا نام ”اندر کی باتیں“ ہے جو اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

”میٹھا زہر“ کی اہمیت و افادیت کے اعتراف میں شعبہ اُردو، جنوں یونیورسٹی نے ”مشتاق احمد دوانی: بحیثیت افسانہ نگار“ کے موضوع پر شکتی دیوی کو 2011ء میں ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کا قلم بہت تیز اور رواں ہے۔ وہ تھک کر بیٹھنے والے قلم کار نہیں ہیں۔ وہ ایک ایسے دیدہ و روزگار ہیں جو اپنے اطراف کا نہایت گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف سوچنے اور سمجھنے والا ذہن رکھتے ہیں بلکہ کچھ کر گزرنے کی تگ و دو میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کئی کتابیں زیر اشاعت اور زیر ترتیب ہیں جن میں سے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”افہام و تفہیم زبان و ادب“ اور خودنوشت سوانح ”خارستان کا مسافر“ نہایت اہم ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ ”اندر کی باتیں“ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو اُن کے بارہ منتخب افسانوں ”اندر کی باتیں، بابا کو کچھ ہو گیا ہے، جسم خور کیڑا، آنکھوں کی عصمت دری، سرگوشی، چھپا سانپ، ایک اہم سوال، باغی، فتنہ، چہرہ چھپائے لوگ، باہر اور اندر کا منظر اور پانچ سال کا بن باس“ پر مشتمل ہے۔ شامل مجموعہ افسانوں کے مطالعہ کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی ایک کامیاب، منفرد اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے تمام افسانے محض افسانے یا فکشن نہیں ہیں بلکہ حقیقی فکشن (Factual Fiction) ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لئے مواد و موضوعات کا انتخاب اسی معاشرے اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے اخذ کرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے تمام افسانے زندگی، معاشرے اور حالات و مسائل سے پوری طرح مربوط ہونے کے ساتھ عصری منظر نامہ بھی ہیں اور عہد حاضر کی تاریخ و تنقید بھی ہیں۔ اُن کے افسانے مغرضی نہیں بلکہ مقصدی ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کے تمام افسانے اپنے ارد گرد کے حالات، انسانی نفسیات، زمانہ کی کجروی، نا آسودگی، اعلیٰ اقدار کی زبوں حالی، سماجی مسائل، بدعنوانی، جنسی بے راہ روی، سیاسی چال بازیوں، ادھورے سپنوں، ازدواجی زندگی کی تلخیوں، ذہنی کشمکش اور متعدد تلخ حقائق کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ عہد حاضر کے مسائل و حالات اور تقاضوں کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور کہانی کو بلند جذباتی و نفسیاتی پہلو سے ہم آہنگ

کرتے ہوئے مسخر آفریں اسلوب سے قارئین کے دلوں کو گرماتے بھی ہیں اور انہیں متاثر کر کے غور و فکر کے لئے مجبور بھی کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی ساحل ہی سے موجوں کی اٹھکھیلیوں کا نظارہ کرنے والے فنکار نہیں ہیں۔ انہوں نے نہ صرف سمندروں کے دھاروں کو چیرا ہے بلکہ تھیٹرے بھی کھائے ہیں۔ انہوں نے صرف ڈرامنگ روم میں بیٹھ کر ہی کہانیوں کی تخلیق نہیں کی ہے بلکہ حالات و زندگی کی ٹھوکریں کھا کر مشاہدات اور تجربات کی مدد سے کہانیوں میں کمال فن سے رنگ بھی بھرا ہے یعنی جگر کو خون کر کے کہانیاں لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجربات، احساسات اور مشاہدات ان کی کہانیوں میں ذہنی، اخلاقی اور جذباتی زندگی کا جزو بن کر ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل انہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ، مشاہدہ، محاسبہ، معلومات اور تجربات سے جو کچھ حاصل کیا ہے اُسے تروتازہ رکھ کر افسانوی پیکر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

افسانہ ”اندرا کی باتیں“ مختص افسانہ نہیں بلکہ اصل واقعہ پر مبنی کہانی ہے۔ یہ کہانی کسی اور کی نہیں خود تخلیق کار مشتاق احمد دانی کی آپ بیتی ہے۔ کہانی کا کردار کل کانت خود مشتاق احمد دانی ہے جسے ذہانت، قابلیت اور اہلیت کے باوجود ایک یونی ورسیٹی میں اسٹنٹ پروفیسر کی اسامی کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ چترنجن باسو جیسے رشوت خور، بدکار، بے ایمان اور بدمعاش شخص کی سفارش اور کوشش سے خیالورام جیسے نااہل کی تقرری کر دی گئی تھی۔ اس کہانی کے کردار کل کانت اور افسانہ نگار مشتاق احمد دانی جیسے بے شمار مستحق امیدوار جن کی آنکھوں کی بینائی لکھتے پڑھتے اور تیاری کرتے کرتے کمزور ہو جاتی ہے، درد کی ٹھوکریں کھاتے، بھٹکتے اور کرب میں مبتلا رہتے ہیں اور چترنجن باسو جیسے بدکار اور رشوت خور خیالورام جیسے نااہل کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ موضوع اور فن پر پوری طرح گرفت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ جنس پرستوں، واسنا میں ڈوبے ہوئے بھوکے بھیڑیوں، نام نہاد سادھوؤں، سنتوں، مذہبی رہنماؤں، جعل سازوں، مفاد پرستوں، سفید پوش سیاہ کاروں کی سیاہ کرتوتوں کو اپنی

کہانیوں کے ذریعہ نہایت فنی چابک دستی سے بے نقاب کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بابا کو کچھ ہو گیا ہے، چھپا سانپ اور ”آنکھوں کی عصمت دری“ جیسے افسانے اُن سادھوؤں، سنتوں کے دوہرے کردار کو اجاگر کرتے ہیں جو بظاہر تو بھگوان کے پجاری معلوم ہوتے ہیں مگر یہ باطن جنس زدہ، واسنا پرست، ہوا و ہوس میں مبتلا اور پاک رشتوں کو ناپاک کرنے والے ہیں۔ سانج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، ایسے لوگ معصوم اور بھولے بھالے عوام و سادہ لوح خواتین کو گمراہ کر کے اپنے دام فریب میں پھنسا کر اُن کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ ”بابا کو کچھ ہو گیا ہے“ کے جیسے اب نہ جانے کتنے بابا، سادھو، سنت، رام کتھا، وعظ، تقاریر اور اپدیش کے ذریعہ دوسروں کو راہِ راست پر لانے کا ڈھونگ کرتے رہتے ہیں اور خود چاندو، فرونی، افیون، چرس، گانجا، بھنگ اور شراب جیسی نشہ آور اشیاء کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

”چھپا سانپ“ کے کردار پنڈت رتن شاستری کی وضع قطع کے سبب لوگ انہیں بھگوان کا روپ سمجھتے تھے۔ انہیں صرف رامائن اور گیتائی کا گیان نہیں تھا بلکہ وہ چاروں ویدوں کے بھی عالم تھے۔ سرمند اہوا، جسم پر سفید دھوتی گرت، ماتھے پر چندن کا تلک، بغل میں پوتھی، ہاتھ میں کیسری رنگ کی مالا، پیروں میں کھڑاؤں، زبان پر منتر اور بھجن یہ ہے اُنچ کوئی کے پنڈت رتن شاستری کا دل کش و دل فریب حلیہ۔ وہ پترا بھی بجاتے تھے اور جادو ٹونا بھی کرتے تھے۔ ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھ کر لوگوں کو خوف زدہ بھی کرتے تھے اور جھوٹی تسلیاں دے کر انہیں بے وقوف بھی بناتے رہتے تھے۔ جنم مرن اور دیگر تقریبات کے موقع پر لوگ انہیں ریت رسم اور سنسکار کے لئے نہایت ادب و احترام سے مدعو کرتے تھے۔ نذرانے اور تحائف کے علاوہ اُن کی خاطر تواضع مقوی غذائوں سے کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوان ناری پر نظر پڑتے ہی اُن کے شریک پانچوں اندریوں میں کلبلاہٹ ہونے لگتی تھی۔ اُن کی پتی مکلیش کماری بیماری کے سبب سردی ہو گئی تھی اس لئے وہ کہیں اور منہ مارنے کے فراق میں بے چین رہتے تھے۔ ایک روز انہوں نے بالجر اپنی جنسی ہوس کا شکار اپنی بہو میناکشی کو بنا ڈالا۔ وہ بے چاری پر کئے پرندہ کی طرح پھڑپھڑاتی رہ گئی اور جب کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اُس کے ساتھ زبردستی کی تو اُس نے پھانسی لگا کر اپنی جان

کرتے ہوئے معر آفریں اسلوب سے قارئین کے دلوں کو گرماتے بھی ہیں اور انہیں متاثر کر کے غور و فکر کے لئے مجبور بھی کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی ساحل ہی سے موجوں کی اٹھکھیلیوں کا نظارہ کرنے والے فنکار نہیں ہیں۔ انہوں نے نہ صرف سمندروں کے دھاروں کو چیرا ہے بلکہ تھیرے بھی کھائے ہیں۔ انہوں نے صرف ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہی کہانیوں کی تخلیق نہیں کی ہے بلکہ حالات و زندگی کی ٹھوکریں کھا کر مشاہدات اور تجربات کی مدد سے کہانیوں میں کمال فن سے رنگ بھی بھرا ہے یعنی جگر کو خون کر کے کہانیاں لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجربات، احساسات اور مشاہدات ان کی کہانیوں میں ذہنی، اخلاقی اور جذباتی زندگی کا جزو بن کر ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل انہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ، مشاہدہ، محاسبہ، معلومات اور تجربات سے جو کچھ حاصل کیا ہے اُسے تروتازہ رکھ کر افسانوی پیکر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

افسانہ ”اندر کی باتیں“ محض افسانہ نہیں بلکہ اصل واقعہ پر مبنی کہانی ہے۔ یہ کہانی کسی اور کی نہیں خود تخلیق کار مشتاق احمد دانی کی آپ بیتی ہے۔ کہانی کا کردار کل کانت خود مشتاق احمد دانی ہے جسے ذہانت، قابلیت اور اہلیت کے باوجود ایک یونی ورسیٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ چترنجن باسو جیسے رشوت خور، بدکار، بے ایمان اور بد معاش شخص کی سفارش اور کوشش سے خیالورام جیسے نا اہل کی تقرری کر دی گئی تھی۔ اس کہانی کے کردار کل کانت اور افسانہ نگار مشتاق احمد دانی جیسے بے شمار مستحق امیدوار جن کی آنکھوں کی بینائی لکھتے پڑھتے اور تیار کر کے کرتے کمزور ہو جاتی ہے، درد کی ٹھوکریں کھاتے، بھٹکتے اور کرب میں مبتلا رہتے ہیں اور چترنجن باسو جیسے بدکار اور رشوت خور خیالورام جیسے نا اہل کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ موضوع اور فن پر پوری طرح گرفت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ جنس پرستوں، واسنا میں ڈوبے ہوئے بھوکے بھیڑیوں، نام نہاد سادھوؤں، سنتوں، مذہبی رہنماؤں، جعل سازوں، مفاد پرستوں، سفید پوش سیاہ کاروں کی سیاہ کرتوتوں کو اپنی

کہانیوں کے ذریعہ نہایت فنی چابک دستی سے بے نقاب کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بابا کو کچھ ہو گیا ہے، چھپا سانپ اور ”آنکھوں کی عصمت دری“ جیسے افسانے اُن سادھوؤں، سنتوں کے دوہرے کردار کو اجاگر کرتے ہیں جو بظاہر تو بھگوان کے پیجاری معلوم ہوتے ہیں مگر یہ باطن جنس زدہ، واسنا پرست، ہوا و ہوس میں مبتلا اور پاک رشتوں کو ناپاک کرنے والے ہیں۔ سماج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، ایسے لوگ معصوم اور بھولے بھالے عوام و سادہ لوح خواتین کو گمراہ کر کے اپنے دام فریب میں پھنسا کر اُن کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ ”بابا کو کچھ ہو گیا ہے“ کے جیسے اب نہ جانے کتنے بابا، سادھو، سنت، رام کتھا، وعظ، تقاریر اور اُپدیش کے ذریعہ دوسروں کو راہِ راست پر لانے کا ڈھونگ کرتے رہتے ہیں اور خود چاندو، فرونی، افیون، چرس، گانجا، بھنگ اور شراب جیسی نشہ آور اشیاء کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

”چھپا سانپ“ کے کردار پنڈت رتن شاستری کی وضع قطع کے سبب لوگ انہیں بھگوان کا روپ سمجھتے تھے۔ انہیں صرف رامائن اور گیتائی کا گیان نہیں تھا بلکہ وہ چاروں ویدوں کے بھی عالم تھے۔ سرمند ہوا، جسم پر سفید دھوتی گرت، ماتھے پر چندن کا تلک، بغل میں پوتھی، ہاتھ میں کیسری رنگ کی مالا، پیروں میں کھڑاؤں، زبان پر منتر اور بھجن یہ ہے اُنچ کوئی کے پنڈت رتن شاستری کا دل کش و دل فریب حلیہ۔ وہ پترا بھی بجاتے تھے اور جادو ٹونا بھی کرتے تھے۔ ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھ کر لوگوں کو خوف زدہ بھی کرتے تھے اور جھوٹی تسلیاں دے کر انہیں بے وقوف بھی بناتے رہتے تھے۔ جنم مرن اور دیگر تقریبات کے موقع پر لوگ انہیں ریت رسم اور سنسکار کے لئے نہایت ادب و احترام سے مدعو کرتے تھے۔ نذرانے اور تحائف کے علاوہ اُن کی خاطر تو وضع مقدس غذائوں سے کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوان ناری پر نظر پڑتے ہی اُن کے شریکر کی پانچوں اندریوں میں کلپاہٹ ہونے لگتی تھی۔ اُن کی بچی کملیش کماری بیماری کے سبب سردی ہو گئی تھی اس لئے وہ کہیں اور منہ مارنے کے فراق میں بے چین رہتے تھے۔ ایک روز انہوں نے بالجر اپنی جنسی ہوس کا شکار اپنی بہو میناکشی کو بنا ڈالا۔ وہ بے چاری پر کٹے پرندہ کی طرح پھڑپھڑاتی رہ گئی اور جب کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اُس کے ساتھ زبردستی کی تو اُس نے پھانسی لگا کر اپنی جان

مالک حقیقی کے سپرد کر دی۔ پنڈت رتن شاستری جیسے نہ جانے کتنے رنگے سیار آئے دن بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کی بالجر عصمت دری کرتے رہتے ہیں۔ کچھ درندوں کی کالی کرتوتیں تو میڈیا وغیرہ کے ذریعہ بے نقاب ہو جاتی ہیں مگر بیشتر حوا کی دُکھیا ری بیٹیاں شرم و حیا اور لوک لاج کے سبب سفید پوشوں کی سیاہ کاریوں کو اپنے سینے میں دفن کر کے زندگی بھر اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہیں یا ”اگلے جنم موہے بیٹیا نہ کیجو“ کہتے ہوئے اپنی جان دے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہیں۔ دراصل تخلیق کار نے اپنے اس افسانہ کے ذریعہ اندھی تقلید نہ کرنے، رنگے سیاروں کے دام فریب میں نہ پھنسنے اور بھوکے بھیڑیوں سے ہوشیار رہنے کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

چھپا سانپ، آنکھوں کی عصمت دری، سرگوشی، چہرہ چھپائے لوگ اور اُن کے دیگر افسانے جنسی تقاضے، جنسی جذبات، جنسی بے راہ روی، جنسی شدت، جنسی کشش، جنسی مسائل، جنسی حقائق، ناٹشایستہ رومنوں اور نفسیاتی تغیرات کے بہترین ترجمان ہیں۔ ”چہرہ چھپائے لوگ“ کالج کی تین لڑکیوں پونم، ہرپریت کور اور فوزیہ بانو کی ایسی کہانی ہے جو آئے دن رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہ تینوں لڑکیاں اپنے چہروں کو چھپا کر اپنے عاشقوں بلکہ اوباش لڑکوں کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر کالج سے بہت دور جا کر اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لئے گھنے جنگل میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ ”آنکھوں کی عصمت دری“ کے پنڈت میگھ ناتھ عہد حاضر کے جنسی شدت پسند ماحول سے نہ صرف بیزار نظر آتے ہیں بلکہ خود کو ایک عرصہ تک سنبھالے بھی رہتے ہیں مگر کیا ون سال کی عمر میں ایک بلوفلم دیکھ کر اُن کے جسم کی اُتھل پُتھل سے انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اُن کی آنکھوں نے زنا بھی کیا ہے اور وہ اپنی سب سے قیمتی چیز بھی لٹا چکے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی نے جس فنکارانہ چابک دستی سے خارجی دنیا کے حادثات و واقعات کو اپنی کہانی میں پیش کیا ہے اتنی ہی فنی مہارت سے داخلی زندگی کی حسرتوں، خواہشوں اور نفسیاتی مسائل کو بھی اپنی کہانیوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں کرداروں کے مزاج و اطوار، نفسیاتی پیچیدگیوں، طبقاتی جہلوں اور حقیقی خدوخال کو نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانہ ”جسم خور کیڑا“ پڑھ کر گوتم بدھ کی اس فکر و تجسس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ انسان کیوں بوڑھا ہو جاتا ہے اور انسان کیوں مر جاتا ہے؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس افسانے کی حسین نوری اور خوب رو غلام عباس کے جسم نہ تو پہلے جیسے گداز اور سڈول ہیں اور نہ اُن کے خد و خال میں پہلی جیسی کشش باقی ہے۔ وہ اپنی شادی کے الہم کی تصویریں دیکھ کر عمر رفتہ کو آواز تو دیتے ہیں مگر حسن، خوبصورتی اور توانائی سے بتدریج محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے اس افسانے اور اپنے منفرد انداز بیان کے ذریعہ قاری کو ایک ایسی سچائی سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے جسے کبھی جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

”پانچ سال کا بن باس“ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کہانی ہے۔ یہ اُن باصلاحیت نوجوانوں کو ہمت و حوصلہ عطا کرتی ہے جن کے دل میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہوتا ہے مگر ناسازگار حالات اور سہولت کے فقدان کے سبب دور دراز یا پس ماندہ علاقوں میں جانا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس افسانہ کی زلفاں بی بی امان اللہ کی سب سے بڑی بیٹی ہے جس نے بائنی میں ایم۔ ایس۔ سی۔ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ ریسرچ کرنے کی تیاری کر رہی تھی کہ اُس کے آبائی گاؤں کے ایک پرائمری اسکول میں بہ حیثیت معلمہ پانچ سال کی مدت کے لئے اُس کی تقرری ہو جاتی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے والد کے کہنے پر اس سروس کو قبول کر لیتی ہے اور تمام پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انتھک محنت، لگن اور صلاحیت سے نہ صرف اس اسکول بلکہ اُس گاؤں کی بھی کایا پلٹ دیتی ہے۔

”اندر اور باہر کا منظر“ ایک ایسا افسانہ ہے جس کے ذریعہ ایسے مشہور ڈکانداروں کی قلمی کھولی گئی ہے جن کی دکان کی چیزیں بظاہر جتنی اصلی، عمدہ اور نفیس معلوم ہوتی ہیں یا مشہور کر دی جاتی ہیں۔ اتنی ہی اُن میں ملاوٹ اور گندگی کے جراثیم بھی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی متوازن اور معتدل فکر اور سوچ کے مالک ہیں۔ وہ نہ تو جانب داری سے کام لیتے ہیں اور نہ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اُن کا افسانہ ”باغی“ تعلیم یافتہ جیون داس برہمن کی کہانی ہے جو کوئل نامی داسی سے کورٹ میرج کر کے دھرم، مذہب، ذات پات کے ٹھیکے داروں اور فرقہ

پرستوں پر کاری ضرب لگا کر ترقی کے لئے ترقی پسند خیالات کی اشاعت کرنا چاہتا ہے۔
ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شہری اور
قصبائی زندگی کی موثر اور ہو بہو تصویر کشی میں بھی بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے بعض
افسانے مختلف کرداروں کے مزاج و اطوار، شہروں کی ہوش ربا زندگی، قصبوں اور دیہاتوں
کی دل کشی اور کائنات کے خوش نما قدرتی مناظر کے بہترین عکاس ہیں۔ بطور مثال پیش
ہے ایسے ہی چند مناظر کی تصویر کشی:

”آج اتوار تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ
ڈالے ہنستے مسکراتے ایک وسیع و عریض اور دل کش پارک میں پہنچ
چکے تھے۔ تقریباً ہر عمر کے مرد و عورتیں چنبیلی، نرگس، جنگلی موتیا، چھوٹی
موتی، گیندے، رات کی رانی اور سرخ و سفید گلاب کے پھولوں کی
بھینی بھینی خوشبو سے اپنے دماغوں کو معطر کر رہے تھے۔ پورے
پارک میں گل آٹھ چنار کے پیڑ ترتیب وار نصب تھے جن کی گھنی
چھاؤں میں ہر شخص تازگی اور راحت محسوس کرتا۔ ان کے علاوہ
دیودار اور مور پنکھ کے چھوٹے چھوٹے پیڑ پارک کی خوب صورتی اور
دل کشی کے ساتھ سیر و تفریح کرنے والوں کو اپنی طرف راغب کر
رہے تھے۔ پورے پارک میں چاروں جانب پھولوں کی کیاریوں
کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ لوہے کے خوش نما بیچ لگے ہوئے
تھے۔“ (افسانہ: سرگوشی)

”نزیش رانا کا سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ مہانگر کے بالکل
وسط میں ہر خاص و عام کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ کھانے پینے اور رہائش
کی تمام سہولیات اس میں موجود ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کے لوگ اس
میں شوق سے ٹھہرتے ہیں۔ جب کہ مظلوم الحال طبقہ کے لوگ اُسے
حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ دن رات کے
چوبیس گھنٹوں میں ایک دنیا اس میں آباد رہتی ہے۔ طرح طرح کے

ارمان بھرے دلوں کے لوگوں کا اس میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دس منزلہ یہ عالی شان ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ ہر وقت نئی نوپلی دہن کی طرح سجا رہتا ہے۔ خاص کر رات کے وقت جب بجلی کے قہقروں کی دھنک رنگ روشنی سے پل پل میں پورے ہوٹل کے چاروں سمتوں پر مختلف طرح کے خوش نما ڈیزائن تیار ہوتے چلے جاتے ہیں تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کی ہر چیز نہایت نفیس، دیدہ زیب، آرام دہ اور عمدہ ہے کہ جو اس میں ٹھہرنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اس میں داخل ہونے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اُس کے دل و دماغ سے دنیا کے غموں، الجھنوں اور مسائل کا غبار دھل گیا ہو اور جسمانی و روحانی سکون کے تمام دروازے اُس کے لئے کھل گئے ہوں۔“ (افسانہ: اندر کی باتیں)

”کیسری رنگ کا گرتہ، سفید دھوٹی، ماتھے پہ چندن کا تلک، سر پہ بودی اور کندھے سے لٹکتا ہوا جھولامیگھ ناتھ کی ایک مخصوص شناخت تھی۔ سیدھے سادے، نرم مزاج، کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار سے کوسوں دور اپنی ڈیوٹی کے پابند، زبان پر ہر وقت اوم، ہری اوم کا ورد رہتا، پرائی عورت پر نظر ڈالنا مہاپاپ سمجھتے تھے۔ صبح جب وہ اپنے دفتر کی طرف نکلتے تو راستے میں ایک کہارن اپنی دکان پر بجی سنوری بیٹھی دکھائی دیتی جس کے بال بکھرے ہوئے، کندھوں تک موٹی تنگی باہیں اور قمیض کا گلا اتنا نفیسی کہ اُس کی معمولی جنبش سے قدرت کا امول خزانہ ہمک ہمک کے باہر آنے کو ترستا۔ اُس کے سرخ گالوں اور موٹی موٹی آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت پر جوں ہی میگھ ناتھ کی اچانک نظر پڑتی تو وہ فوراً نظر پھیر لیتے اور گناہ کا احساس اُن کے رگ وریشے میں دوڑ جاتا۔ (افسانہ: آنکھوں کی عصمت دری)

دراصل ڈاکٹر مشتاق احمد وانی معاشرتی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل اور عصری

حالات و واقعات کو پہلے مختلف زاویوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں پھر اُس کا پلاٹ تیار کر کے افسانے کے فارم میں ڈھال دیتے ہیں۔ اُن کی کہانیاں تہہ دار ہوتے ہوئے بھی پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہیں۔ اُن کا لب و لہجہ سلیس اور شستہ ہے۔ طرزِ بیان میں ادبیت اور شگفتہ اسلوب کے سبب اُن کی باتیں نہ صرف دل و دماغ میں ثبت ہو جاتی ہیں بلکہ روح کی گہرائیوں میں بھی اُتر جاتی ہیں۔ کہانی، پلاٹ، کردار، منظر نگاری، مکالموں کی چستی و برجستگی اور واقعات کی ترتیب کے اعتبار سے اُن کی کہانیاں منفرد نظر آتی ہیں۔ انہیں اپنے کرداروں کی جذباتی، نفسیاتی اور مزاجی کیفیات کو تصادم، ٹکراؤ اور تضاد کے ذریعہ بامعنی اور بامقصد بنانے کے ساتھ افسانوں میں دل چسپ رنگ بھرنے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تمام افسانے لایعنی، بے ربط، منتشر اور مبہم خیالات، علامات و استعارات سے پاک و صاف ہیں۔ اُن کی کہانیاں جامع اور مکمل ہونے کے ساتھ عہدِ حاضر کے حقائق و مسائل کی سچی اور حقیقی تصاویر ہیں۔ کہانی، موضوع، تکنیک، اسلوب اور زبان و بیان کی انفرادیت اور دیگر فنی خصوصیات کے سبب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں بلکہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بھی نظر آتے ہیں۔



رفیق شاہین

(علی گڑھ، یوپی)

08979248741

مشاق احمدوانی کا ایک شاہکار افسانہ 'اندُر کی باتیں' تجزیہ

مجھے مشاق احمدوانی کا افسانہ 'اندُر کی باتیں' کے مطالعے نے افسردہ کر دیا ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ عصر حاضر کے پر آشوب اور دارو گیر معاشرے میں روحانی تہذیبی اور اخلاقی قدریں کما حقہ دم توڑ چکی ہیں۔ خود غرضی، منکاری، وریا کاری، عیاری وادکاری، زر پرستی و زر گرگی، بے حسی و مردہ ضمیری، بد عنوانی و بد نظمی جیسی تمام بدعتوں اور برائیوں کا سماج میں ہر جگہ بول بالا ہے اور مظلوم انسانیت بڑی بے بسی سے بدی و بدکاری کے ہاتھوں نیکی و صداقت کی پسمائی اور ذلت و خواری کے المناک و دردناک منظر اپنی منناک آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ آج سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی، مذہبی اور تعلیمی کوئی بھی شعبہ حیات ایسا نہیں ہے جہاں Corruption نے اپنی جڑیں مستحکم نہ کر لی ہوں۔ صاحبان اقتدار حقدار کو اس کے حق سے محروم کر کے اور پرائے حق کو نا اہلوں کے ہاتھ فروخت کر کے بے ایمانی سے کمائی لاکھوں کی دولت پر ذرا بھی شرمسار نہیں ہوتے بلکہ بددیانتی کو اپنی ذہانت و ذکاوت پر محمول کر کے فخریہ انداز میں خود کو شاہی دیتے ہیں۔ کہانی میں شعبہ تاریخ کے سربراہ چترنجن باسو کا اسسٹنٹ پروفیسری کے امیدوار مکمل کانت کو اپنی نگہ باز سے ناپسند قرار دلوانا اور انتہائی نا اہل خیالورام کو پانچ لاکھ بطور رشوت لے کر اپنے شعبے کا پروفیسر بنوا دینا۔ بے حسی، مردہ ضمیری، بددیانتی اور بے غیرتی کی ایک ایسی ہی المناک

وشرمناک اور افسوسناک مثال ہے۔ ہمارے معاشرے میں چترنجن باسو، منوج اگروال، کلدیپ سنگھ اور اسی سالہ کندن لعل جیسے بے ایمان اور ضمیر فروشوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان بکاؤ لوگوں کے الگ الگ بھاؤ ہوتے ہیں۔ چترنجن باسو نے تو ایک انسان کے مستقبل کا قتل اس لئے کیا کہ اس فعل بد سے اس نے پانچ لاکھ کی رقم اینٹھ لی اور ہاں وہ ۸۰ سالہ ضعیف وکثیف کندن لعل جس کے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں جب مکمل کانت کو انٹرویو میں ناکام کرنے کے لئے وہ شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں کا درمیانی فاصلہ معلوم کر رہا تھا۔ اس وقت اس بے ضمیر کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ کسی وقت بھی موت اس کی روح قبض کر سکتی ہے اور بھگووان کی عدالت میں وہ کیا جواب دے گا؟ انٹرویو کمیٹی میں دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ بھی موجود تھے۔ وہ چاہتے تو مداخلت کر کے ہر لحاظ سے مستحق امیدوار کو اس کا حق دلا سکتے تھے۔ اس سے دارالعلوم کا تعلیمی معیار بلند ہی ہوتا مگر وہ بھی اس بوڑھے عیار کے مضحکہ خیز سوالات پر تبسم ہی فرماتے رہے اور انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ خیالورام دارالعلوم کے نام پر سرتا سر دھبہ ہے کلنک ہے۔ اس کی وجہ بھی چترنجن باسو جیسے تیز طرار اور شاطر لوگ ہی ہوتے ہیں جو دوسروں کی نفسیاتی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر انہیں بے آسانی اپنے شیشے میں اتار لیتے ہیں۔

بہر حال کہانی میں ہیرو کی پسپائی، مظلوم انسانیت کی پسپائی ہے۔ آج کے مادہ پرست زمانے اور صارفیت کے دور میں زرگری اور مادی لامحدود اشیاء کی ہوس وطلب نے انسان سے اس کی انسانیت چھین لی ہے۔ وہ جائز و ناجائز کی تفریق سے نا آشنا ہے اور اب وہ غرض و ہوس کا پتلہ دوسروں کے دکھ درد کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف اپنے اپنے مفادات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

کہانی کار کے اسلوب یا طرز نگارش میں زبان کی سادگی، صفائی، شگفتگی، بے ساختگی، شگلی، شائستگی، تازگی، شیفنگی اور سیل بلا کی سی روانی بڑی لطیف اور فرحت بخش محسوس ہوتی ہے۔ کردار حقیقی ہیں جو زندگی سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی کا متوقع مگر حقیقی انجام دیر پا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

حقائق کی اساس پر استوار کامیاب اور موثر کہانی ترقیم کرنے پر میں اس کے خالق جناب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو صمیم قلب سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر خالد اشرف

ایسوسی ایٹ پروفیسر کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی

0996828472

افسانے میں ایک نیا امکان

آج اردو افسانے کی عمر ایک صدی سے کافی زائد کا سفر طے کر کے نہایت مستحکم اور بسیط ہو چکی ہے۔ اگر غزل ہماری شاعری کی آبر و قراردی جاتی ہے تو بلاشبہ نثری اصناف کی سرکردگی کا مقام کہانی یا افسانے کو حاصل ہو چکا ہے اور جب کوئی بھی صنف ادب وسعت اور بلوغت حاصل کرتی ہے تو اس کا ایک پہلو زمان و مکان سے آزادی کا ہوتا ہے اور دوسرا پہلو علاقائی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کا بھی موجود ہوتا ہے۔

علاقہ جموں و کشمیر نہ صرف اردو شاعری، ناول اور افسانے کا مستقل موضوع رہا ہے بلکہ اس خطے سے اردو کے کئی سرکردہ فکشن نگار سامنے آئے جنہوں نے کہانی کو ایک نیا محاورہ اور نیا مقامیہ (Locale) فراہم کیا۔ ان ہی فکشن نگاروں کے سلسلے میں ایک نام مشتاق احمد وانی کا بھی اضافہ ہوا ہے جو بنیادی طور پر افسانہ نگار محقق اور نقاد ہیں۔ زیر نظر افسانوی مجموعہ ”اندکری باتیں“ وانی صاحب کا تیسرا مجموعہ ہے جس کی زیادہ تر کہانیاں ملک کے اہم رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔

جہاں تک ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا مجموعی تاثر ہے وہ یہ ہے کہ یہ کہانیاں دہلی اور ممبئی جیسے بڑے تجارتی و سیاسی مراکز سے دور بیٹھ کر لکھی گئی ہیں اور اسی لئے ان کے کرداروں کے آپسی رشتے زیادہ تیز رفتار اور زیادہ مغرب زدہ نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ

سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کی تہذیب و ثقافت کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے یا اسے مختلف النوع ثقافتوں Cultures کا گلدستہ Collective قرار دیا جاسکتا ہے؟

میرے خیال میں کسی ملک یا علاقے کی ثقافت میں مذہب، زبان، رسوم، لباس، غذا اور لوک روایات کے علاوہ موسموں اور تیوہاروں کا بھی بنیادی رول ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی ایک کلچر یا طرز فکر پر اصرار کرنا غیر جمہوری رویہ ہوتا ہے جو باہمی چپقلش اور تشدد کی طرف لے جاتا ہے۔ چونکہ ہندوستان دنیا کے چند بڑے ملکوں میں شمار ہوتا ہے اس لئے اس کو 'برصغیر' Sub Continent کہا جاتا تھا۔ چنانچہ آج بھی شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کے ہندوستانی صوبوں اور خطوں میں ثقافتی اشتراک کم اور اختلاف زیادہ پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف کوئی خطرناک یا پریشان کن عنصر نہیں ہے بلکہ ہماری رنگ برنگی تہذیب کی اساس ہے۔

اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ مشتاق احمد دانی کا افسانہ ان کے خطہ مخصوص کا نہ صرف نمائندہ ہے بلکہ اس خطے کے تمام تر ثقافتی پہلو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔ ان کی کہانی کے بارے میں جو اولین تاثر ابھرتا ہے وہ اس کی قصباتی Town Based کلچر ہے جس کا بڑے شہروں کی چکا چوندھ، دولت کی فراوانی اور بے لگام آزادی کی پیدا کردہ عریانی و آوارگی سے کوئی رشتہ یا علاقہ نہیں ہے۔ یہ کلچر گاؤں اور قصبے کے نیم زراعتی اور نیم تعلیم یافتہ نظام اقدار کے تابع ہے جس میں ابھی رشتوں کی پائیداری بھی باقی ہے اور محلے پڑوس کا لحاظ پاس بھی لیکن ایسا نہیں ہے کہ مشتاق احمد دانی کی کہانیوں کا سماج جامد و ساکن ہے اور یہ ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ ایک طرف یہاں باہری آبادکاروں کا گزر کم ہے لیکن دوسری طرف ٹیلی ویژن، سنیما اور انٹرنیٹ کی پیدا کردہ حشر سامانیاں آہستہ آہستہ اس معاشرہ کو بھی مغربیت اور فرد پرستی Individualism کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اور اسی تبدیلی کی ناپسندیدگی کے پیدا کردہ تناؤ (Tension) کا اظہار افسانوں کے اس مجموعے میں ہو رہا ہے جن کو آپ پسند یا ناپسند تو کر سکتے ہیں، نظر انداز نہیں کر سکتے۔

آئیے مشتاق احمد دانی کے افسانوں کو ذرا با تفصیل ملاحظہ کریں۔ مثلاً ان کے

افسانے 'سرگوشی' کو لیں۔ یہ ایک ایسے نوجوان جوڑے کی کہانی ہے جو اپنے پابند معاشرے سے دور چھپ کر محبت اور قرب کے مواقع تلاش کرتا ہے لیکن یہاں دو کردار ایسے بھی ہیں جن کی فکر اور اعمال پر دقیا نویت کی مہر لگی ہوئی ہے اور یہ ان دونوں جوان دلوں کی ہم آہنگی کو برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی طرح 'آنکھوں کی عصمت دری' کا میگھ ناتھ اپنے والدین کی دقیا نویت کے آہنی شکنجے میں اس طرح فکری حسن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی جدید ترقیات سے بے بہرہ ہونے کا خواہشمند ہے۔ وہ قدامت پرستانہ اقدار کے تحت زندگی بسر کرتا ہے اور کسی خوبصورت وجود کو نظر بھر دیکھنا بھی گناہ تصور کرتا ہے۔ اب نہ وہ سینما دیکھنے کا اہل رہا ہے اور نہ ہی فن مصوری کے شاہکار۔ دراصل بے جا پابندیوں نے اس کی شخصیت کو مخ کر دیا ہے۔ 'چہرہ چھپائے لوگ' بھی اسی نوعیت کا افسانہ ہے جس میں نوجوانوں کو آزادانہ جنس مخالف سے مراسم قائم کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اسی لئے وہ والدین کی نگرانی سے بچ کر، آبادیوں سے دور، جنگلوں اور ویرانوں میں گناہ اور شرمندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

'اندر کی باتیں' میں مصنف نے اس تعلیمی مافیا کے گھناؤنے کردار پر روشنی ڈالی ہے جس نے اس مقدس شعبے کو بے ایمانی، رشوت خوری اور اقربا پروری کے اڈے بنا دیا ہے۔ یہاں رشوتیں دے کر تقرر کیے جاتے ہیں، جعلی مقالے ڈگری کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ پروفیسروں اور پرنسپلوں کے گھروں پر خدمت کر کے لیکچرر کے عہدے حاصل کئے جاتے ہیں اور شراب پلا کر امتحانات کے رزلٹ تبدیل کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی چونکہ خود رس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اس لئے وہ اس شعبے کی غلامت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

'چھپا سانپ' ایک جنسی مسئلے پر مبنی ہے جس میں ایک بوڑھا اپنی جنسی ہوس (یا ضرورت) کی تکمیل کے لئے اپنی بہو کو نشانہ بناتا ہے کیونکہ خود اس کی بیوی جسمانی طور پر تقریباً ناکارہ ہو چکی ہے۔ بہو ذلت و ندامت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی کر لیتی ہے اور بوڑھا رتن ناتھ شاستری قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ 'جسم خور کپڑا' بھی بڑھاپے کے مسئلے کا احاطہ کرتا ہے لیکن جسمانی نہیں فلسفیانہ سطح پر یہاں بوڑھوں کی تنہائی اور ترقی یافتہ

سماج میں اولادوں کے ساتھ چھوڑ جانے کے مسئلے کو انسانی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے کہ عمر کے آخری حصے میں انسان کو آخری منزل کا سفر یکہ وتہا طے کرنا ہوتا ہے اور یہی جدید ترقیات کی شناخت بن گئی ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی نے عام مذہبی مفروضات کو موضوع بنا کر کچھ دلچسپ افسانے بھی 'قلمبند' کئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'ایک اہم سوال' میں اس مفروضے پر سوال قائم کیا گیا ہے کہ دنیا میں ہر اچھا برا کام خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک بہانہ ہے جو سماج کو غیر ذمہ داری اور تن آسانی کی طرف لے جاتا ہے۔ دراصل انسان صاحب عقل اور اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اپنے ہر فعل کا ذمہ دار ہے اور خدا کو درمیان میں لانا مناسب رویہ نہیں ہے۔ افسانہ 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے' میں ان نام نہاد سادھوؤں کی قلمی کھولی گئی ہے جو مذہب کی آڑ میں بہت سے جائز و ناجائز دھندے کرتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان جنت نشان میں ان ڈھونگی باباؤں اور سادھوؤں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ کہانی 'فتنہ' میں ایک مسجد کے نوجوان امام کی ذرا سی غلطی کو مزاحیہ انداز میں موضوع بنایا گیا ہے کہ موبائل فون کی لعنت آج کل کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔

'باہر اور اندر کا منظر' بھی ایک مزاحیہ نوعیت کا افسانہ ہے کہ تجارت پیشہ لوگ منافع کی ہوس کی تکمیل کے لئے کیا کیا پست طریقے استعمال کرتے ہیں۔

افسانہ 'باغی' ایک اہم سماجی مسئلے کو زیر بحث لاتا ہے۔ ذات پات میں تقسیم سماج میں جب ایک نوجوان ایک دولت دوشیزہ سے شادی کر لیتا ہے تو اس کو گھر میں اور گھر سے باہر کے پسماندہ معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مشتاق احمد دانی کے افسانے اپنے اطراف کے روزمرہ کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں اور قیصری ادبی کاوش ہونے کی بنا پر ان کا یہ مجموعہ یقیناً توجہ دیے جانے کے لائق ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ڈاکٹر مشتاق احمد دانی مزید پختہ اور متنوع نوعیت کی کہانیاں لکھیں گے۔ افسانہ نگاری کا یہ سفر جاری رہنا چاہئے۔



دو باتیں ان افسانوں سے متعلق

ڈاکٹر مشتاق احمد دانی سے میری پہلی ملاقات پنجاب کے ایک شہر مالیر کوٹلہ کے ایک سمینار میں ہوئی تھی، جسے اردو کے مشہور افسانہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے اپنے افسانہ کلب کی جانب سے منعقد کیا تھا۔

مشتاق احمد دانی ایک عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں اور مختلف ادبی رسائل میں نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ضخیم مقالہ نسائی ادب کے موضوع پر کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ جسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے مجھے اپنے افسانوں کا مسودہ بھیجا کہ میں اس پر کچھ لکھ دوں۔ وہ اپنا افسانوی مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ میرا طریقہ ہے کہ میں اپنے بعد آنے والی ادبی نسل کی جہاں تک ہو سکے ہمت افزائی کرتا ہوں تاکہ وہ ادب سے پورے جوش کے ساتھ جڑی رہے۔ اسی نیت سے میں نے پورے خلوص کے ساتھ دانی کے افسانوں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنے افسانوں کے لئے مواد اپنے آس پاس ہی سے حاصل کرتے ہیں اور ان کے افسانوں کے کرداروں سے ہماری ملاقات ہر خطہ میں ہو جاتی ہے۔ انہیں افسانہ لکھنے کے لئے کبھی کسی بہت بڑے موضوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

افسانہ 'جسم خور کیزا' ان ماں باپ کی کہانی ہے جو اپنے اطراف بے بس، مفلوک الحال اور اپنی اولادوں کے رویوں سے پریشان والدین کو دیکھتے ہیں تو ان کے مستقبل کی

آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ افسانہ ایک اہم سوال، انسان کی بد اعمالیوں اور عہدے کے ناجائز استعمال سے کشید کی گئی دولت کا انجام سامنے لاتا ہے۔ یہیں پر جبر و اختیارات کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو افسانہ 'باغی' کے ذریعے قومی یکجہتی کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، مذہبی چولا پہنے ہوئے سادھو سنتوں کی نشہ آور چیزوں کے استعمال پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ افسانہ 'چھپا سانپ' اس جنس زدہ سرسری بد اعمالیوں کو بے نقاب کرتا ہے جو اپنی ہی بہو کے ساتھ اپنا منہ کالا کرتا ہے، افسانہ 'سرگوشی' ان دودوستوں کی کہانی ہے جو اپنی شرارتوں سے دو محبت کرنے والوں کے درمیان نفاق پیدا کرتے ہیں۔ افسانہ 'آنکھوں کی عصمت دری' اس نوجوان کی کہانی ہے جو اپنی پکلی خطا کی ایسی سزا پاتا ہے کہ پھر جائز کام سے بھی احتیاط برتنے لگتا ہے۔ افسانہ 'فتنہ' باہر اور اندر کا منظر اور افسانہ 'چہرہ چھپائے لوگ' میں کہیں شخصیت پرستی، کہیں لڑکیوں اور لڑکوں کی بے راہ روی اور کہیں دھوکہ دہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں سب سے طویل افسانہ 'اندر کی باتیں' کالج اور یونیورسٹیوں میں ملازمت کے سلسلے میں ہونے والی دھاندلیوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

ان افسانوں کو ایک ابھرتے ہوئے قلم کار کی کاوشوں کے نظریے سے دیکھیں تو اس سے مستقبل کی اچھی امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بھی احساس پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کہانیاں سوچتی ہیں اور وہ لکھنا چاہتے ہیں منظر کشی کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔



رواقِ جمال

(دُرگ چھتیس گڑھ)

09981072672

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی حق گوادیب

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کی اردو بستیوں میں بھی ایک دیدہ ورنقاد، محقق، مفکر اور منفرد کہانی کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے اب تک دو افسانوی مجموعے 'ہزاروں غم' اور 'میٹھا زہر' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'اندرا کی باتیں' شائع کروانے کی تیاری میں مشغول ہیں اسی سلسلے میں انہوں نے مسودے کی کاپی میرے پاس بھیج کر مجموعے میں شامل افسانوں پر میری رائے و خیالات کا اظہار اور تبصرے کی فرمائش کی ہے۔ فنی قلم کار کی تخلیق پر رائے دینا اپنے خیالات کا کھلے دل سے اظہار کرنا اور تبصرہ کرتا تینوں کام مشکل ہی نہیں نہایت مشکل ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی میرے عزیز ہیں۔ قابل ہیں، اچھے نثر نگار ہیں، حق کے پجاری ہیں، اور سچائی، حق گوئی، صاف گوئی کو ہضم کرنے کا مادہ رکھتے ہیں اس لئے میں نے جسارت کی ہے کہ 'اندرا کی باتیں' میں شامل افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد چند سطریں لکھ کر دوستی کا فرض ادا کر دیا جائے۔

میری معلومات کے مطابق مشتاق احمد وانی نے اسکول کالج کے زمانے سے ہی قلم کو تھام لیا تھا اور نثر سے رشتہ جوڑ لیا تھا جبکہ اکثریت میں نوجوان شاعری کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن مشتاق نے نثر کا انتخاب کیا اور آج ان کے فیصلے نے انہیں بام عروج پر پہنچا

دیا۔ اکثر ان کی کہانیاں افسانے اور ملک کے مختلف رسائل میں میری نظروں سے گزرے ہیں۔ مشتاق کا اپنا انداز ہے ان کے لکھے پر کسی کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ مشتاق کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انہیں لکھنے کے لئے سوچنا نہیں پڑتا وہ حقیقتوں کو افسانے کا جامح پہنا کر نایاب تخلیق بنانے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کا انداز بیان، قلم کی روانی، زبان پر گرفت ان کی تخلیقات میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں دلچسپی کی لے بھر کر رکھتے ہوئے قلم کو چلانے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ مجموعے میں شامل افسانے ان کے مخصوص طرز اسلوب کے آئینہ دار ہیں جو قاری کے ذہن تک بہ آسانی رسائی پانے میں کامیاب رہیں گے۔ پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی مجھے ان کے فن میں دور دور تک دکھائی نہیں دی یہ کمال ہی قلم کار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

مجموعے میں شامل پہلا افسانہ اندر کی باتیں، طویل افسانہ ہے۔ مشتاق نے ایک حقیقت کو افسانے کا رنگ دے کر قمر طاس پر بکھیر کر قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ افسانے کے اختتام پر چترنجن باسو صاحب کا انجام پڑھ کر رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ افسانے مطالعے سے سبق ملتا ہے کہ دوسروں کا برا چاہنے دوسروں کا برا کرنے اور حق تلفی کرنے کا خمیازہ چند لوگوں کو اس دنیا میں اور چند لوگوں کو آخرت میں ہر حال میں بھگتنا ہے۔ مشتاق اگر اس پلاٹ پر افسانے کی بجائے ناول لکھتے تو میرا ماننا ہے کہ یہ ان کا شاہکار ناول ہوتا۔ مجموعے کا دوسرا افسانہ ہے 'جسم خور کیز' جسم خور کیزے میں مشتاق احمد نے آج کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ آج اولادیں، والدین کو ساتھ رکھنا نہیں چاہتی ہیں بلکہ زندگی کے آخری پڑاؤ پر انہیں اپنے سے دور کر دیتی ہیں یا ان پر احسان کرتے ہوئے انہیں اولڈ ایج ہوم بھیج دیتی ہیں۔ اس افسانے میں ایسے ہی والدین کا ذکر ہے۔ مجموعے کا تیسرا افسانہ 'فتنہ' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ہر افسانے میں زمینی حقیقت سے جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ فتنہ میں بھی مشتاق نے مسجد میں نماز کے دوران موبائل کی گھنٹی بج جانے کے عمل کو لے کر ایک اچھا افسانہ رقم کیا ہے۔ افسانہ پڑھ کر قاری اگر کچھ سیکھتا ہے تو یہ مشتاق کی استادی ہے۔ مجموعے کا چوتھا افسانہ ایک اہم سوال ہے۔ ایک اہم سوال میں مشتاق نے نہایت اہم مسئلے پر افسانہ لکھا ہے۔ ہم بات بات میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہے، یہ بالکل غلط

ہے۔ اللہ کبھی برا نہیں کرتا ہے اور نہ وہ کسی کا برا چاہتا ہے۔ مشتاق نے نہایت خوبصورتی سے اس نازک مسئلے پر افسانہ لکھا ہے اور ایک عالم سے اس کے فرض کے دائرے میں پر اثر مکالمے ادا کروا کر مشتاق نے اپنی دینی معلومات کے ساتھ ساتھ خدا پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ مجموعے کا پانچواں افسانہ ہے 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے'۔ بابا کو کچھ ہو گیا ہے طنزیہ افسانہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں باباؤں کا جو حال ہے وہ آپ اور میں ٹی وی پر ہر روز دیکھ رہے ہیں۔ مشتاق نے بھی ایک ایسے ہی ڈھونگی بابا کو افسانے کا ہم کردار بنا کر باباؤں پر لفظوں کے تیر چلا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا اچھا تجربہ کیا ہے۔ مشتاق افسانوں کے پلاٹوں کی طرح افسانوں کے عنوانات بھی چن چن کر لاتے ہیں۔ مجموعے کے اگلے افسانے کا عنوان ہے 'آنکھوں کی عصمت دری' آنکھوں کی عصمت دری میں مشتاق نے پرورش کو نشانہ بنایا ہے کہ بچوں کی جس طرح پرورش کی جاتی ہے وہ عملی زندگی میں اسی پرورش کو اپناتے ہیں۔ لیکن ہم ترقی کی دوڑ میں شامل ہو کر پرورش اور کردار کے معنی کھوتے جا رہے ہیں۔ اگلے افسانے کا عنوان ہے 'باغی' بغاوت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ لیکن جب بغاوت اولاد کرے وہ بھی ایک عورت کے لئے تو ماں باپ ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اس افسانے کا ہیرو بھی ایک لڑکی کے لئے ماں باپ سے سماج سے بغاوت کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایک دای لڑکی کے لئے۔ لڑکا برہمن ہے اور لڑکی کم ذات کی۔ لڑکا سماج کو اونچ نیچ کے گرداب سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ ایک میلے کی بھیڑ کے سامنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو میلے میں موجود لوگ اس کی باتوں کو سمجھنے کی بجائے اس کو پاگل سمجھتے ہیں۔ "باغی" ہندوستان جیسے ملک جو ذات پات اور اونچ نیچ کے گردوغبار سے اٹا پڑا ہے اچھا درس دیتا ہے۔ مجموعے کے اگلے افسانے کا عنوان ہے 'چھپا سانپ'۔

'چھپا سانپ' افسانے میں پنڈت رتن شاستری کا کردار نہایت دلچسپ ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے کردار کی وجہ سے سماج میں بھگوان کی طرح پوجاتے ہیں لیکن جب گھر کی چہار دیواری میں ان کے اندر کا حیوان جاگتا ہے تو وہ بھول جاتے ہیں کہ بہو بیٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں اور بہو کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں۔ مشتاق نے افسانے کو اپنے دل نشیں پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ فطری طور پر افسانہ کہنے

کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کا انداز بیان قاری کو باندھ کر رکھنے میں ان کی بھرپور مدد کرتا ہے۔ افسانہ باہر اور اندر کا منظر میں اونچی دکان پھیکے پکوان کو مشتاق نے نہایت ہی شاندار طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ پوری کہانی مشتاق کے تجربے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ 'چہرہ چھپائے لوگ' میں مشتاق نے ایک حقیقت کو افسانہ بنایا ہے۔ آج کل کالج کا ماحول بالکل افسانے میں پیش کئے گئے منظر کے مطابق ہے اور معاشرے میں لڑکیوں کی سوچ کردار افسانے کے کرداروں کی مانند ہے۔ جب سے میں نے مشتاق کا افسانہ "چہرہ چھپائے لوگ" پڑھا ہے تب سے مجھے ہر چہرہ چھپانے والی لڑکی پونم ہر پریت اور فوزیہ لگتی ہے اور میں راج محمد کی طرح سوچنے لگتا ہوں کہ یہ کون سے جنگل کا رخ کرنے والی ہے۔ اور یہ سول میرے ذہن و دل کو نوچتا رہتا ہے جب تک کہ میں سر کو جھٹک کر اس سوال سے نجات حاصل نہ کر لوں۔ آپ کو بھی اپنے شہر میں چہرہ چھپاتے ہوئے لڑکیاں نو جوان کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار نظر آئیں گی "چہرہ چھپائے لوگ" پڑھنے کے بعد کئی سوالات آپ کو بھی بے چین کر دیں گے۔ اگر آپ کے گھر میں بھی کوئی نو جوان لڑکی ہے اور وہ بھی چہرہ چھپا کر نکلتی ہے تو شک کی بجلی کو نڈ کر آپ کو ہلا کر رکھ دے گی۔ مشتاق نے اچھے موضوع کو افسانہ بنا کر نو جوانوں کی رہنمائی کی بھرپور کوشش کی ہے۔

مجموعے کا اگلا افسانہ ہے 'سرگوشی' سرگوشی میں خواتین کی عام بیماری ہے شک! کو مشتاق نے ایک خوبصورت افسانے کا رنگ دے کر پیش کیا ہے جو تفریح کے لئے پڑھا جاسکتا ہے۔ افسانے میں تل کا پہاڑ ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا کہ آپ پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔ اس بات کا مجھے بھروسہ ہے۔ 'پانچ سال کا بن باس' میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا فنی و تخلیقی شعور معراج کمال کو پہنچ چکا ہے۔ ذلفاں بی بی اس افسانے کا نمائندہ کردار ہے جو دیہات میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے اور بالآخر اپنے عزم و ارادے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شرافت، محبت، دیانتداری اور مشکلات برداشت کرنے کے بعد وہ ایک اونچے عہدے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ مشتاق احمد وانی کی سحر انگیز افسانوی زبان اور پرکشش اسلوب بیان قاری کو ذہنی حظ فراہم کرنے کے ساتھ معاشرتی، ثقافتی اور جمالیاتی پہلوؤں سے بھی آگاہی فراہم کرتا ہے۔

مشتاق کا تخلیقی سفر ۲۵ سالوں پر محیط ہے۔ آپ کے مجموعے میں شامل افسانوں کو میں نے غور سے پڑھا ہے۔ آپ کے تمام افسانوں میں فکر و شعور کی بالیدگی اور احساس و آگہی کا عنصر قاری کو نمایاں نظر آئے گا۔ آپ کے افسانوں کے کردار قاری کو اپنے آس پاس ہی نظر آئیں گے۔ آپ نے کرداروں کو مستعار کرنے کی لغزش نہیں کی۔ آپ کا انداز بیان کافی دلکش و دلچسپ اور فصاحت و بلاغت سے بھرپور ہے جو قاری کو زبان کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکا تا بلکہ افسانے کے اختتام تک سیدھے سیدھے سفر کرواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے اندر کی باتیں میں شامل تمام افسانے چاہے سماجی ہوں، مذہبی ہوں یا تخلیقی ہوں سماج کی دکھتی رگ پر انگلی ضرور رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مشتاق کا یہ مجموعہ مقصدی اعتبار سے کافی مقبول ہوگا اور اس کی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔ میں نے اپنے خیالات رقم کئے ہیں باقی کام تو مجموعے کی اشاعت کے بعد نقاد اور مبصر کر دیں گے۔ میری دلی دعا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی یہ کوشش یہ جہت انہیں کامیابی کی بلندیاں عطا کرے۔ آمین ثم آمین!



ڈاکٹر عظیم راہی
(اورنگ آباد مہاراشٹر)

09423781787

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانہ اندر کی باتیں کا تجزیہ

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی جموں و کشمیر علاقے کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں اور اپنی تخلیقات کے حوالے سے ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں اپنی ایک انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ اردو فکشن میں ان کی بے پناہ دلچسپی اور شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ”تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران“ موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور جموں و کشمیر کے ایک ایسے اسکالر ہونے کا شرف بھی انہیں اس صدی کے اوائل میں حاصل ہوا ہے جنہیں بہت کم عمری میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ’ہزاروں غم‘ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۸ء میں دوسرا مجموعہ ’میشاز ہر منظر عام پر آکر مقبول ہوئے ہیں۔ جو عصری اردو افسانے کے باب میں اپنی تخلیقی جہت کے امتزاج کو اردو قارئین کے سامنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید کے کئی معتبر ناموں سے داد و تحسین حاصل کی جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، پروفیسر عتیق اللہ اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کے حوالے سے بحیثیت افسانہ نگار جموں یونیورسٹی میں ایم فل کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ افسانوں کے ساتھ تحقیقی و تنقیدی

مضامین بھی جو مختلف ادبی رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں ان پر مشتمل تین مجموعے آئینہ در آئینہ، اعتبار و معیار اور شعور بصیرت کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوئے اس کے علاوہ ان کی دیگر کئی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں، جن میں بطور خاص عالمی خواتین ادیبوں پر ان کی ضخیم کتاب ”اُردو ادب میں تانیثیت“ قابل ذکر ہے اور اب ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ’اندر کی باتیں‘ کے نام سے منصفہ شہود پر بہت جلد جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اس تازہ مجموعہ کے ناکمل افسانہ کا مختصر تجزیہ یہاں قارئین کی نذر ہے۔

زیر نظر افسانہ ’اندر کی باتیں‘ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کی ایک ایسی اچھوتی تخلیق ہے جس میں انہوں نے آج کے ایک اہم سلگتے ہوئے موضوع کو قلمبند کیا ہے۔ اس افسانے میں جہاں دور حاضر کے تعلیمی اداروں میں جاری بدعنوانیوں اور نا انصافیوں کی کہانی بیان کی گئی ہے وہیں یہ افسانہ ایک قابل شخص کی ناقدری اور استحصال کی دلدوز داستان کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانہ میں جملے کردار ہیں۔ جن میں تین کلیدی حیثیت کے حامل ہیں اور باقی چار ثانوی نوعیت کے لیکن یہی کردار افسانے کی بہت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ افسانہ کا مختصر جسٹ یہی ہے کہ نریش رانا ایک سیون اسٹار ہوٹل کا مالک ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار کمل کانت اس کا مخلص دوست ہے جو چھ ماہ بعد جب اس ہوٹل میں ملنے آتا ہے۔ انتہائی پریشان اور بد حال حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو نریش رانا کے استفسار پر اپنا حال زار بیان کرتا ہے اور مثالیں دے کر پہلے اپنے غم کا احساس دلاتا ہے اور پھر اپنے ’احوال واقعی‘ سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے غم کی اصل وجہ کیا ہے خود کمل کانت کی زبانی سنئے:

”سنئے بھیا آپ ہی کے کہنے پر میں نے دارالعلوم کے شعبہ تاریخ میں اسٹنٹ پروفیسر کی اسامی کے لئے فارم بھرا تھا لیکن مجھے بری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میرا مستقبل تاریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ میرے لئے بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا حق بری طرح مجھ سے چھینا گیا ہے۔“

یہ اقتباس پورے افسانے کی کہانی بیان کرتا ہے اور قاری پر موضوع کی شدت کو واضح کرتا ہے۔ آگے اس کا حق کیسے چھینا گیا اور حق چھیننے والا کون ہے اس کی پوری رداد

نریش رانا کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ جو وہ مکمل کانت پر ظاہر کرتا ہے اور اس کے خلاف کی گئی پلاننگ سے اسے واقف کرواتا ہے جس کے سبب اس کا حق مارا گیا ہے۔

”مکمل کانت تیرے خلاف بنائی گئی پلاننگ کا مجھے پورا پتہ ہے غور سے سن تیرا حق چھیننے والا شخص شعبہ تاریخ کا سرپرست چترنجن باسو ہے۔ میری اس سے دوستی تو نہیں البتہ اس نے مجھے اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ اس کا اکثر میرے یہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔“

چترنجن باسو کو س قبیل کا آدمی ہے اس کا اندازہ نریش رانا کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس سے اس کے کردار پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

”مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ممتحن بن کے کہیں جاتا ہے تو کال گرل بک کرواتا ہے اور ایسی مدر کی خواہش میں رہتا ہے جس کے پیٹنے سے آدمی کی آنکھیں دن کو بھی تارے گنگنے لگتی ہیں اور وجود زمین پر ڈھیر ہونے لگتا ہے۔ مکمل کانت سنو، چترنجن باسو بہت چتر آدمی ہے وہ اہم سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات کو قابو کرنے کے لئے محفلیں منعقد کرتا ہے۔ پچاس روپے کا گلدستہ ہاتھوں میں تھما دیتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے کا شال کاندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس منافقانہ انداز سے وہ ان کے روشن ضمیر کی کلفی دیوبج لیتا ہے۔ پھر وہ اس کی بداعمالیوں پہ لب کشائی نہیں کر پاتے۔“

آج کل تعلیمی اداروں میں تقررات کے نام پر جولوٹ کھسوٹ ہو رہی ہے اور اس میدان میں ایک طرف لین دین کا بازار گرم ہے تو دوسری سمت اس شعبہ میں رشوت خوری و بدعنوانی عروج پر ہے۔ جس کے سبب نا اہلوں کے لئے پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حصول بھی آسان ہو گیا ہے کہ ممتحن کی آؤ بھگت کر کے ڈگری ایوارڈ کر لی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں اکثر اسکا لرو اپنا حقیقی موضوع تک یاد نہیں رہتا ہے۔ بعد میں ایسے بوگس ڈگری ہولڈرس کا لکچر میں لکچرار اور پروفیسر بن جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا کردار اس افسانہ میں خیالورام کا ہے جو اپنے نام کی طرح خیالی نہیں حقیقی لگتا ہے اور وہ چترنجن باسو کی خدمت کر کے اور باقاعدہ

سودا طے کر کے لیکچر رشپ کے انتخاب کے لئے اپنی راہ ہموار کر لیتا ہے۔ لیکن اس قسم کے استاد کو تعلیم یافتہ کہنا حقیقی معنوں میں پڑھے لکھے افراد کی توہین کے مترادف ہے۔ یہ لوگ جامعات میں ان بیساکھیوں سے پہنچ کر طلاب کا مستقبل تاریک کر کے ملک اور سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں اور وہیں اس سبب قابل، محنتی، ایماندار اور مستحق اسکا لری حق تلفی ہوتی ہے جس سے قوم و ملت کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ یہاں بھی چترنجن باسوا اپنے اثر و رسوخ کے ناجائز استعمال اور سودے بازی کے ذریعے سلیکشن کمیٹی کے ممبران کو اپنے امیدوار کے حق میں رام کر لیتا ہے۔ آخر میں نریش رانا، مکمل کانت کو ان حالات کے تناظر میں سمجھاتے ہوئے 'اندر کی باتیں' بتاتے ہوئے سچائی کا یوں اظہار کرتا ہے

”جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکیہ مفت میں نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی، تجھے پتا ہونا چاہئے دولاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔“

یہ سن کر مکمل کانت کو گہری ضرب لگتی ہے۔ اور وہ مایوسی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ بے حد طول و اداس ہو جاتا ہے۔ اپنا انتخاب نہ ہونے پر اور حق بہ حقدار رسید نہ ملنے کے سبب اس قدر دلبرداشتہ ہو جاتا ہے کہ وہ خودکشی کرنے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ تو کبھی کسی آنکھ وادی گروپ میں شامل ہو جانا چاہتا ہے اور انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی ساری کتابوں کو دریا برد کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا دوست نریش رانا اسے ہمت دیتا ہے دلا سہ تسلی کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ وہ پرماتما کے آگے ہاتھ اٹھائے اور ۲۱ دنوں کا جاپ کرے اور بھگوان سے مانگتا رہے اس کی مراد ضروری پوری ہوگی۔ مکمل کانت کی آہوں اور کراہوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ جاپ پورا ہوتے ہی اسے پتہ چلتا ہے کہ چترنجن باسو کے پورے جسم میں بے حسی کی بیماری پھیل گئی ہے۔ یہی افسانہ کا نقطہ عروج ہے کہ چترنجن باسو کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے اور اسے آخر کوڑھ کی بیماری لگ جاتی ہے۔ میری نظر میں یہ کوڑھ صرف چترنجن باسو جیسے لوگوں کو نہیں لگی بلکہ ایسے افراد کی وجہ سے پورے دارالعلوم کو لگ گئی ہے۔ اور پورے سماج کو اس لاعلاج بیماری نے گھیر لیا ہے۔ ورنہ کبھی مستحق امیدوار کا نہ

استحصال ہوتا اور نہ ہی حق داروں کی یوں حق تلفی ہوتی اور تعلیم دینے والے کے مقدس اداروں میں رشوت خوری اور بدعنوانی کی بیماریاں کبھی نہیں پھیلتیں، جس کے سبب نئی نسل کا مستقبل کس قدر خراب ہوا ہے۔ اس کا تصور کرنا بھی اب محال لگتا ہے۔ یہ ایک ایسا سنگت ہوا سوال ہے جو افسانہ نگار نے قاری کے ذہن میں پیدا کر دیا ہے۔ اسے مسلسل کچو کے لگاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

دراصل زیر نظر افسانہ افسانہ نگار کے دل کی آواز لگتی ہے۔ چونکہ مشتاق احمد وانی درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں اس شعبے میں آج کل بدعنوانی، بد اخلاقی اور حق تلفی کا جو نظام رائج ہو گیا ہے شاید وہ بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ اور اس اذیت ناک کرب کو جھیلا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندرون کا کرب بڑے درد مندانہ انداز میں اکثر جگہ ابھرا آیا ہے۔ جو ذاتی نوعیت کا ہو کر بھی اس ماحول میں رہنے والے ہر شخص کو اپنا لگتا ہے جسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس صورت حال کا پورا منظر نامہ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری کی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے جو اسے متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

الغرض مختصر مگر اہم کرداروں کے ذریعے برجستہ مکالموں اور چست پلاٹ کے ساتھ مشتاق احمد وانی نے ایک اچھا افسانہ تخلیق کیا ہے۔ افسانہ کی زبان آسان سادہ اور رواں دواں ہے۔ بہر کیف یہ افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک عمدہ کہانی کو موثر انداز میں پیش کرتا ہے جس میں زبردست عصری حسیّت ہے اور عصری آگہی کا ادراک بھی۔ افسانہ میں تمام اجزائے ترکیبی بدرجہ اتم موجود ہیں جو پڑھنے والے کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ جو ہر اچھے افسانہ کی ایک بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مشتاق احمد وانی کا یہ ایک قابل ذکر افسانہ ہے جو تعلیمی اداروں کے اندر کی بہت ساری باتوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔

آخر میں مشتاق احمد وانی کو اس کامیاب تخلیق پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد کے ساتھ اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔



ابوبکر عباد

(شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

09810532735

مشتاق احمد وانی

سماجی، معاشرتی اور حالاتِ حاضرہ کے افسانے نگار

فلشن ہر دور میں اردو کی پسندیدہ، مقبول اور ہر دل عزیز صنف رہی ہے۔ جب سائنسی ایجادات نے تفریح کے نئے نئے، سستے اور حیرت انگیز آلات ہمارے گھروں اور ہماری جیبوں میں نہیں پہنچائے تھے تو زندگی کی بھاگ دوڑ اور بے طرح مصروفیت سے انسان فرصت کے چند لمحات نکال کر فلشن کا مطالعہ کر لیا کرتا تھا؛ کہ پڑھے لکھے حضرات اور خواندہ لوگوں کی تفریح کا یہ واحد ذریعہ تھا جو قلب و ذہن کو سکون و طمانیت شعور کو بالیدگی اور روح کو فرحت و تازگی بخشتا تھا۔ آج کی اس تیز رفتار زندگی اور تکنیکی دور میں بھی فلشن کی پذیرائی اور مقبولیت باقی ہے اور کافی حد تک اسے مسرت و بصیرت عطا کرنے کا مقدس اور محبوب وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔

اردو فلشن بالخصوص افسانے کی اہمیت یہ ہے کہ صرف ملک کے طول و عرض میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں اور تقریباً سبھی طبقوں میں شوق سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اردو افسانہ کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس کے گیسو سنوارنے والوں میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور اس کے فنی، موضوعاتی اور تکنیکی تجربوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ ایسے اساتذہ کی ایک طویل

فہرست ہے جو درس و تدریس اور تحقیق و تنقید میں منہمک رہنے اور سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کے ساتھ ساتھ فکشن کی تخلیق میں بھی مصروف ہیں۔ انہی افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صاحب۔ مشتاق احمد وانی کا تعلق جنت نظیر کشمیر کی وادی سے ہے، کشمیر خود اپنی خوبیوں اور خوبصورتیوں کی بنا پر افسانوی دنیا سے کسی طور کم نہیں ہے۔

مشتاق صاحب بنیادی طور پر ایک استاذ ہیں اور تحقیق و تنقید سے سروکار رکھنے کے علاوہ کافی عرصے سے افسانے بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر نصف درجن کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں ”ہزاروں غم“ (۲۰۰۱ء) اور ”میٹھا زہر“ (۲۰۰۸ء)، افسانوی مجموعے بھی شامل ہیں۔

مشتاق احمد وانی صاحب سماجی اور معاشرتی موضوعات کے علاوہ حالات حاضرہ کے مسائل اور اپنے ارد گرد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فکر و احساس کو کہانیوں کے قالب میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور انھیں سوچ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک مخصوص مثبت اور اصلاحی پہلو ہوتا ہے جسے ان کے طرز خاص سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ امید ہے کہ ان کے پہلے افسانوں کے مجموعوں کی مانند اس مجموعے ”انداز کی باتیں“ کو بھی اردو حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔



مشاق احمد وانی ایک مشاق کوزہ گر

مشاق احمد وانی نے ایک ساتھ کئی مشعلیں جلا رکھی ہیں۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق — ان تینوں کے طور و طرز الگ ہیں مگر ایک ہی مرکزہ سے جڑے ہوئے ہیں۔

مشاق وانی نے اپنی ریاضت، محنت، ژرف نگاہی، جاں سوزی، عرفاں و آگہی سے اس مثلث کو مقدور بھی معتبر کیا ہے اور ان تینوں منطقوں میں اپنی ایک الگ پہچان قائم کی ہے۔ اُن کی بنیادی شناخت تو ایک ناقد اور محقق کی ہے مگر انہوں نے تخلیقی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ’افسانوی کائنات‘ سے اُن کے ذہن کا بہت مضبوط اور گہرا رشتہ ہے۔ اسی لئے انہوں نے تنقید اور تحقیق کے متوازی اُس تخلیقی عمل کو بھی جاری رکھا ہے مقتدر جرائد و رسائل میں اُن کے افسانوں سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ ان افسانوں میں ان کے ذہن اور داخلی احساس کے سارے رنگ نظر آتے ہیں۔ زندگی کے وہ تجربات و حوادث جن سے وہ گزر رہے ہیں، وہ تمام تجربے ان کے افسانوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات کو اپنے تخلیقی تجربے میں ڈھالا ہے۔ آج کی زندگی کے جو موضوعات، مسائل ہیں، اُن کو اپنے افسانوں میں بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں کہیں کہیں شخصی یا سوانحی بیانیے (Narratives) بھی آگئے ہیں۔ ”اندرو کی باتیں“ کردار کی تبدیلی کے ساتھ اُن کا ایک ایسا شخصی بیانیہ ہے یا ایسی سرگزشت جس میں فنکار نے اپنا الٹرا گیو بنا کر اپنی ہی زندگی کے تجربوں کو افسانے کی شکل دی ہے:

”کمل کانت! جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی مکئیہ مفت میں نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی تجھے پتا ہونا چاہئے دولاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔“
(افسانہ ”اندر کی باتیں“)

یہ آج کی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ تعلیمی مافیا پر ایک گہرا طنز ہے۔ جامعات میں تقرری کے تعلق سے جو عام تصورات ہیں، اس کی تصدیق ہوتی ہے، دھاندلی، بگڑم بازی، جوڑ توڑ — پیسہ، یہ وہ حقیقتیں ہیں جو اس افسانہ کا حصہ بنی ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے اس پورے ریکٹ کا پردہ فاش کیا ہے۔ جو تعلیمی نظام میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ افسانہ تقرری میں عدم شفافیت پر سوالیہ نشان قائم کرنا ہے:

”رانا صاحب! اگر آپ یہ بھی نہیں چاہتے ہیں تو پھر میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی تمام کتابیں اور رسائل کہ جو میرا عمر بھر کا اثاثہ ہے کسی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں پھینک آؤں، تاکہ آئندہ مجھے کسی دارالعلوم کے انٹرویو کے لئے یہ منوں بوجھ اپنے کندھوں پر نہ اٹھانا پڑے۔“ (افسانہ ”اندر کی باتیں“)

کہانی کے کردار کا یہ ردِ عمل جامعات میں تقرری کے طریقہ کار کے خلاف سخت احتجاج ہے یہ ایک اقتباس پس پردہ کے سچے کھیل کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کی کہانیوں میں اس طرح کے طنز اور تلخیوں کی زیریں لہریں موجود ہیں۔ مگر مشتاق احمد وانی نے اپنی فطری معصومیت کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ اُن کی ہر کہانی میں وہ معصومیت دھیرے سے در آئی ہے۔ انہوں نے دہشت میں محبت، نفرت میں اخوت کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ایک شورش زدہ، شدت پسند ماحول نے بھی اُن کے بنیادی حیلے کو تبدیل نہیں کیا ہے۔ بلکہ منفی ماحول سے بھی انہوں نے مثبت اثر قبول کیا ہے۔

مشتاق وانی کی کہانیوں پر اُن کے شورش زدہ ماحول کا معکوسی اثر ہے۔ اُن کی کہانیوں میں زیریں سطح پر ٹرانسفارمیشن کا عمل جاری و ساری ہے۔ خارجی دہشت داخلی

محبت میں تقلیب کا عمل اُن کی کہانیوں کا جواز ہے۔ خواب اور خوف کے تصادم اور کشمکش میں بھی اُن کا داخلی ذہن خواب کو قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیاں ساحر لہر دھیانوی کی طرح خواب بننے کی بات کرتی ہیں۔ ایک معصومانہ تحیر اُن کی کہانیوں کا تخلیقی عنصر ہے۔ اُن کی کہانیوں کے کردار یگانگت، اخوت، یکجہتی اور اتحادی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں مشتاق وانی کا صالح اور صحت مند ذہن پوری کلیت کے ساتھ متحرک اور فعال نظر آتا ہے۔ مشتاق وانی کی کہانیاں زبان کی ثولیدگی، ابہام اور ہمہلیت سے پاک ہیں۔ وہ صاف ستھری اور ترسیلی زبان استعمال کرتے ہیں — نہ زبان نہ کردار اور نہ ہی پلاٹ میں جھول ہے۔ وہ سیدھے سادے بیانیہ پر یقین رکھتے ہیں۔ زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے آگاہ ہیں۔ اس لئے اُردو کے بنیادی اُسلوب سے منحرف نہیں ہوتے — وہ فلسفیانہ مباحث اور ادق مسائل کو بھی بڑی فن کاری اور خوب صورتی سے اپنی کہانیوں کا جزو بناتے ہیں مگر کہیں بھی ان نظریات کا جو جھل پن ان کی زبان کی نزاکت و لطافت کو مجروح نہیں کرتا۔ مشتاق وانی ایک مشتاق کوزہ گر کی طرح اپنی کہانیوں کی مٹی کو اپنے جادوئی لہر سے اس طرح خوب صورت رنگ روپ دیتے ہیں کہ ان کی کہانیوں کی خاموشیاں بھی بول اُٹھتی ہیں:

”وہ دیکھو ہمارے شہر کے امیر ترین آدمی لالہ مدن گوپال آج کس بے سرو سامانی کے عالم میں ہیں۔ یہ وہی مدن گوپال ہیں جو کئی فیکٹریوں، کارخانوں اور گاڑیوں کے مالک تھے۔ لیکن آج جسم خور کیڑے نے ان کا کیا حال بنا رکھا ہے۔“ (افسانہ ”جسم خور کیڑا“)

اولڈ اچ پر مبنی یہ کہانی فلم ”باغبان“ کی یاد دلادیتی ہے۔ بوڑھے جس درد، کرب اور اذیت سے گزرتے ہیں۔ اس کو لئے سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔ آج یہ معاشرتی مسئلہ نہ صرف ہمارے ذہن بلکہ ضمیر کو بھی جھنجھوڑتا ہے۔ یہ سماجی نفسیات اور سانگے سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ یہ اقدار کے زوال کا مسئلہ بھی ہے اور قدروں کی تبدیلی کا اشاریہ بھی۔ مشتاق وانی نے اس طرح کے سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اور ہمارے ذہن اور ضمیر پر دستک دے کر ہمیں بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک فن کار کا جو

معاشرتی فریضہ ہے اُس کی ادائیگی مشتاقِ وانی نے بہتر طور پر کی ہے۔ اُنہوں نے اپنے دل کی بات کو زبانِ دی ہے۔ مُنورِ بدایونی کی طرح ان کا مدعا بس اتنا ہے کہ:

پردہٴ دل میں جو نغمے تھے زباں تک پہنچے

دیکھئے اب مری آواز کہاں تک پہنچے

اس آواز میں درد بھی ہے، کرب بھی، محرومی بھی، شکستگی بھی، مگر یہ دل کی آواز ہے

اس لئے رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس آواز کے حلقہٴ اثر میں سماج بھی آئے گا اور شورشِ زدہ

سیاست بھی — مشتاقِ احمدِ وانی کی یہ افسانوی آواز اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوگی — اتنا مجھے یقین ہے۔



ڈاکٹر سید اختیار جعفری

ڈائریکٹر مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی، آگرہ

09897871667

افسانوں میں شعری لب و لہجہ کا ترجمان مشتاق وانی

اکیسویں صدی میں اردو افسانہ نئی صورت حال سے نبرد آزما ہے۔ گزشتہ ربع صدی میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کو ایسے مسائل کا سامنا ہے جن کے بارے میں کسی نے سوچا نہیں تھا۔ سائنس کی بے تحاشا ترقی، جسمانی آرام و آسائش کے بے شمار اسباب، تباہ کن اقتصادی تفاوت، جنسی انارکی، عورتوں کے خلاف روز افزا اضافہ پذیر جنسی معاملے، نفرت آمیز گھریلو تشدد، گھروں میں ہی اپنوں کی زد میں جنسی استحصال کا شکار خواتین، ناقابل برداشت عریانیّت، ہر سطح پر موجود کرپشن، نفرت آمیز سیاست، بے تحاشہ بڑھتی مہنگائی، مذہب کا کاروباری استعمال، دہشت گردی اور نسل واد سے لے کر ٹارگٹ کلنگ، ایڈس، بردہ فروشی اور سرکاری غارت گری تک بے شمار مسائل ہیں جن میں پھنس کر آج کا انسان سخت ذہنی تناؤ کا شکار ہے۔ اس کا ماضی اسے سکون نہیں دیتا۔ وہ حال سے سخت غیر مطمئن ہے اور اس کا مستقبل بھی مایوس کن۔ ان کے علاوہ بھی کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جن کی ہمارے معاشرے کو کانوں کان خبر نہیں۔ بعض موانع ایسے بھی ہیں کہ ہماری آبادی کا ۲۵، ۲۰ فیصد حصہ جو باخبر اور خواندہ ہے، اس تک بھی بوجہ بہت سی خبروں کی رسائی نہیں۔ تاہم تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال باخبر شاعریا افسانہ نگار جب ایسی خبروں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے نقطہ نظر سے

انسانی معاشرے کی بھلائی اور کائنات کی بقا کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے لوگوں تک پھیلا یا جائے تو موانع کے باوجود کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ اور اب تو کچھ عرصہ سے یہ ”دام ہر موج میں ہے حلقہ ضد کام نہنگ“

والا معاملہ درپیش ہے۔ ”قطرے کو گہرے ہونے تک“ بڑے بڑے ہفت خواں کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن تخلیقی صلاحیت والا افسانہ نگار نہایت درجہ ہنرمندی سے فنی پردے میں چھپا کر وہ خبر یا وہ خاص بات ادب کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اُردو کے بعض افسانہ نگار نہایت درجہ ہنرمندی اور بڑی نیک نیتی اور مستعدی سے اس نیک کام پر لگے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی باہر، مستعد اور وسیع النظر افسانہ نگاروں میں مشتاق وانی بھی شامل ہیں۔ جن کا تازہ تخلیقی شاہ کار ”اندر کی باتیں“ اس وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔

”اندر کی باتیں“ کا خالق مشتاق وانی جنت نظیر کشمیر کے فرزند ہیں۔ اس لحاظ سے عام لوگوں کے مقابلے ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل دوسروں سے کچھ زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یہ پیچیدگی ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس پیچیدگی کے اظہار کا ان کا طریقہ بے حد سادہ اور سپاٹ ہے۔ انہوں نے فنی چابک دستی اور ہیئت کے حوالے سے جو روایتی افسانے تخلیق کیئے ہیں اُن میں ایک مرکزی نقطہ نظر قائم کر کے واقعاتی تانا بانا بنا ہے، اسی تانے بانے کے ذریعے انہوں نے واقعات، کردار اور مسائل پر کاری وار کئے ہیں۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ”افسانہ برائے افسانہ“ نہیں لکھتے۔ وہ بے مطلب کبھی بھی اور کچھ بھی لکھنے کے قائل نہیں:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

وہ بہت سوچ سمجھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ حقیقت پسندوں کی طرح ”تھیم“ کا انتخاب کریں۔ لیکن جہاں تک تھیم کا تعلق ہے، وہ آخر تک تھیم کو نبھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

عام طور پر مشتاق وانی کے افسانے سپاٹ اور امکانی نظر آتے ہیں۔ وہ بیانیہ میں گھماؤ پھراؤ کے عادی نہیں۔ سیدھی سادی بات واضح اسلوب میں قاری کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے لئے وہ عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ واقعات کی رفتار معمولی رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی ایچ انہیں زیادہ ادھر ادھر بھٹکتے نہیں دیتی۔ بلکہ کبھی کبھی حالات اتنی تیزی سے تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ گویا:

کام تھے عشق میں بہت پر میر

ہم ہی فارغ ہوئے شبابی سے

لیکن سرعت اور تغیر کے باوجود وہ تقسیم اور اپنے پلاٹ پر مضبوط گرفت بنائے رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے ”سرگوشی“ پڑھ ڈالئے۔ دو ٹکے، گھر بدر، اوباش اور شیطان صفت نو جوان دو پیار کرنے والوں میں کیسے پھوٹ ڈال دیتے ہیں اور پھر کیسے مزے لیتے ہیں یہ غور کرنے کی بات ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات جو افسانہ نگار بین السطور میں کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ پیار میں جسمانی تلذذ سے زیادہ اہمیت اعتبار رومعیاری کی ہے۔ ذرا سی بات میں تمام تعلقات منقطع کر دینا تو عشق میں ممکن ہے نہ مناسب۔ اس افسانے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعتی دور کے جنسی یا جسمانی لگاؤ کو عشق سمجھ لینے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ چوتھی خاص بات یہ ہے کہ ان باتوں کو بیان کرنے کے لئے افسانہ نگار صنعتوں، استعجاب، تجرید، آرٹ یا استعاروں و تشبیہوں کا استعمال نہیں کرتا بلکہ صنعتوں، الفاظ اور سپاٹ بیانیہ سے کام لیتا ہے۔ اس تکنیک کا وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

تخلیق کا گہرا تعلق تنقید سے ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی چونکہ بذات خود تنقید نگار اور محقق بھی ہیں۔ تنقید کا تعلق ادبی تخلیق سے ہے اور ادبی تخلیق کا تعلق فکر، جذبے، مشاہدے، احساس، تجربے اور جمالیاتی اظہار پر قدرت سے ہے۔ یہ تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور تبدیل ہوتی رہیں گی اس کے لئے نقاد اور خالق کو اپنا ذہن ہمیشہ کھلا رکھنا چاہئے۔ اس میں رد و قبول کی صلاحیت سب سے زیادہ ہونا چاہئے۔ اگر تنقید نگار خشک پتے کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے لگے تو ادبی تفہیم بے سمتی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ نئے تنقید نگاروں بہ شمول جاوید رحمانی، لیتھ رضوی، ظہیر رحمتی، اطہر مسعود، رضا حیدر اور ڈاکٹر مشتاق وانی میں یہ مثبت رجحان موجود ہے۔

مشتاق وانی محاکات اور منظر کشی پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا معرکہ

انسانی معاشرے کی بھلائی اور کائنات کی بقا کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے لوگوں تک پھیلا یا جائے تو موانع کے باوجود کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ اور اب تو کچھ عرصہ سے یہ ”دام ہر موج میں ہے حلقہٴ ضد کام نہنگ“

والا معاملہ درپیش ہے۔ ”قطرے کو گہرے ہونے تک“ بڑے بڑے ہفت خواں کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن تخلیقی صلاحیت والا افسانہ نگار نہایت درجہ ہنرمندی سے فنی پردے میں چھپا کر وہ خبر یا وہ خاص بات ادب کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اُردو کے بعض افسانہ نگار نہایت درجہ ہنرمندی اور بڑی نیک نیتی اور مستعدی سے اس نیک کام پر لگے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی باہنر، مستعد اور وسیع النظر افسانہ نگاروں میں مشتاق وانی بھی شامل ہیں۔ جن کا تازہ تخلیقی شاہ کار ”اندر کی باتیں“ اس وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔

”اندر کی باتیں“ کا خالق مشتاق وانی جنت نظیر کشمیر کے فرزند ہیں۔ اس لحاظ سے عام لوگوں کے مقابلے ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل دوسروں سے کچھ زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یہ پیچیدگی ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس پیچیدگی کے اظہار کا ان کا طریقہ بے حد سادہ اور سپاٹ ہے۔ انہوں نے فنی چابک دستی اور ہیئت کے حوالے سے جو روایتی افسانے تخلیق کیے ہیں اُن میں ایک مرکزی نقطہ نظر قائم کر کے واقعاتی تانا بانا بنا ہے، اسی تانے بانے کے ذریعے انہوں نے واقعات، کردار اور مسائل پر کاری وار کئے ہیں۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ”افسانہ برائے افسانہ“ نہیں لکھتے۔ وہ بے مطلب کبھی بھی اور کچھ بھی لکھنے کے قائل نہیں:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

وہ بہت سوچ سمجھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ حقیقت پسندوں کی طرح ”تھیم“ کا انتخاب کریں۔ لیکن جہاں تک تھیم کا تعلق ہے، وہ آخر تک تھیم کو نبھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

عام طور پر مشتاق وانی کے افسانے سپاٹ اور امکاکی نظر آتے ہیں۔ وہ بیانیہ میں گھماؤ پھراؤ کے عادی نہیں۔ سیدھی سادی بات واضح اسلوب میں قاری کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے لئے وہ عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ واقعات کی رفتار معمولی رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی انج انہیں زیادہ ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتی۔ بلکہ کبھی کبھی حالات اتنی تیزی سے تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ گویا:

کام تھے عشق میں بہت پر میر

ہم ہی فارغ ہوئے شابی سے

لیکن سرعت اور تغیر کے باوجود وہ تقسیم اور اپنے پلاٹ پر مضبوط گرفت بنائے رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے ”سرگوشی“ پڑھ ڈالئے۔ دو نکلے، گھر بدر، اوباش اور شیطان صفت نوجوان دو پیار کرنے والوں میں کیسے پھوٹ ڈال دیتے ہیں اور پھر کیسے مزے لیتے ہیں یہ غور کرنے کی بات ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات جو افسانہ نگار بین السطور میں کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ پیار میں جسمانی تلفذ سے زیادہ اہمیت اعتبار اور معیار کی ہے۔ ذرا سی بات میں تمام تعلقات منقطع کر دینا تو عشق میں ممکن ہے نہ مناسب۔ اس افسانے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعتی دور کے جنسی یا جسمانی لگاؤ کو عشق سمجھ لینے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ چوتھی خاص بات یہ ہے کہ ان باتوں کو بیان کرنے کے لئے افسانہ نگار صنعتوں، استعجاب، تجرید، آرٹ یا استعاروں و تشبیہوں کا استعمال نہیں کرتا بلکہ صنعتوں، الفاظ اور سپاٹ بیانیہ سے کام لیتا ہے۔ اس تکنیک کا وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

تخلیق کا گہرا تعلق تنقید سے ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی چونکہ بذات خود تنقید نگار اور محقق بھی ہیں۔ تنقید کا تعلق ادبی تخلیق سے ہے اور ادبی تخلیق کا تعلق فکر، جذبے، مشاہدے، احساس، تجربے اور جمالیاتی اظہار پر قدرت سے ہے۔ یہ تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور تبدیل ہوتی رہیں گی اس کے لئے نقاد اور خالق کو اپنا ذہن ہمیشہ کھلا رکھنا چاہئے۔ اس میں رد و قبول کی صلاحیت سب سے زیادہ ہونا چاہئے۔ اگر تنقید نگار خشک پتے کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے لگے تو ادبی تفہیم بے سستی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ نئے تنقید نگاروں بشمول جاوید رحمانی، لیتیق رضوی، ظہیر رحمتی، اطہر مسعود، رضا حیدر اور ڈاکٹر مشتاق وانی میں یہ مثبت رجحان موجود ہے۔

مشتاق وانی محاکات اور منظر کشی پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا معرکہ

الآراء افسانہ ”اندر کی باتیں“ اس بات کا غماز ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں دینا جہان کی جزئیات بھرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ انے وسیع مطالعہ کو اپنے کرداروں کے ذریعے سائنس، آرٹ، سنگیت یا فلسفے پر بحث کرتے نظر نہیں آتے۔ وہ گول مول الفاظ بھی نہیں لکھتے۔ وہ ذومعنی الفاظ سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ قاری کو تذبذب میں نہیں ڈالتے۔ منہ کی طرح ان کے افسانوں کے انجام کا پتہ آخر تک نہیں چلتا اور قاری تذبذب و اشتیاق کی حالت میں ڈوب رہتا ہے۔ اختتام یا کلائمکس تک پہنچ کر اسے ویسا ہی جھکا لگتا ہے، جیسا منہ کے افسانوں میں۔ فرق دونوں میں ادب کے سلسلے میں ان کے نقطہ نظر کے باعث ہے۔ منہ کی طرح ان کی اکثر کہانیوں میں جہاں انہوں نے سماج کی کسی برائی کی تصویر کشی کی ہے۔ بے پناہ غصہ ہے۔ یا کھسیا ہٹ ہے۔ وہ اپنے غصے یا کھسیا ہٹ کو دباتے نہیں بلکہ کرداروں کے ذریعے الفاظ میں انڈیل دیتے ہیں۔ وہ دراصل انسانی اخلاق کی برتری کے قائل ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر مشتاق وانی کی ایک اور افسانوی خصوصیت بیان کر کے یہ مضمون ختم کر دوں گا۔ حالانکہ مشتاق وانی اوّل و آخر ایک نثر نگار ہیں۔ لیکن کہیں کہیں دل کے کسی گوشے میں وہ شاعر بھی ہیں۔ خواہ انہوں نے ایک بھی غزل یا نظم نہ کہی ہو لیکن ان کے افسانوں میں جہاں کہیں قدرت کے خوبصورت مناظر، حسین عورت یا مرد کا ذکر آتا ہے، ان کے بیان سے جیسے شاعری پھوٹ کر بننے لگتی ہے۔ ان کی تشبیہیں ایسی نادر اور دل کو چھو لینے والی ہوتی ہیں کہ اچھے اچھے شاعر کو بھی پسینے آجائیں۔ شاعرانہ فقرے ایک خوبصورت سماں کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر میرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا



مشتاق احمد دوانی اور ان کے افسانے

زندگی اور کہانی لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی کہانی کو زندگی سے اور زندگی کو کہانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بات کو کسی مفکر نے یوں بیان کیا ہے کہ 'کہانی کے پس پردہ زندگی دھڑکتی ہے'۔ گویا کہانی کوئی وقت گزاری یا چٹخارے کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کی سچائیوں کی حقیقی تصویر پیش کر کے اس کی بہت سی سچائیوں سے پردہ ہٹاتی ہے جو کہ عام انسانوں کے تخیل سے پرے ہے۔

ایک سچا فن کار جس عہد میں سانس لیتا ہے اس کے اثرات اس پر مرتب ہونا لازمی ہیں۔ ہمارے ارد گرد نیکی اور بدی کی قوتوں میں جو کشمکش دیکھنے کو ملتی ہے اسی کے سچ و خم سے کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کی کہانیاں اسی پس منظر کی پیداوار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادے طریقے کے ساتھ بیانیہ انداز میں سماج میں پھیلی کمزوریوں اور اچھائیوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار ہماری روزمرہ زندگی کا تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ 'فنتہ لیجے'۔ ایک طرف جہاں انسانی فہم و ادراک نے اونچی زقند لگا کے آسمان کو چھو لیا، وہیں دوسری طرف وہ اخلاقی پستیوں کی گہری کھائی میں گرنا چلا گیا۔ یہ رفعت و ابتذال کا سلسلہ تھا نہیں۔ جن چیزوں سے وہ محفوظ اور مستفید ہوتا رہا انہی چیزوں نے اسے فحاشی، مادہ پرستی، بد اخلاقی اور بے راہ روی کی طرف دھکیل دیا۔ موبائل کی ہی

مثال لیجئے کہ آئے دن ایس ایم ایس کی شکایتیں سننے کو ملتی ہیں۔ موبائل جہاں رحمت بن کر آیا وہیں اس نے نئی نئی بدعتوں اور مصیبتوں کو جنم دیا۔ مولوی نعیم الدین جس نے اپنی زندگی اللہ کی بندگی میں گزاری۔ عبادت اور پرہیزگاری کو انہوں نے اپنی زندگی کا شعار بنالیا۔ وہی مولوی نعیم دین جب موبائل کی موہ میں پڑ گئے تو اسی آلہ مصیبت نے ان کی برسوں کی عبادت ایک پل میں مٹی میں ملا کے رکھ دی۔ ایک رنگ ٹیون نے بھری محفل میں انہیں چل دخوا کر کے چھوڑا۔ ملاحظہ کیجئے

”اب مولوی نعیم الدین زبانی خطبہ پڑھ رہے تھے اور تمام نمازی بڑی عظمت کے ساتھ سر جھکائے خطبہ سن رہے تھے۔ وہ جو نئی خطبے سے فارغ ہوئے تو سب نمازی صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ چورا ہے والی مسجد کی چاروں منزلیں نمازیوں سے کھینچ بھری ہوئی تھیں۔ امام نے تکبیر اولیٰ کہی تو تمام مقتدیوں نے دونوں ہاتھ کانوں کی لوتک اٹھائے اور ہاتھ باندھ کے قیام میں مولوی نعیم الدین کی دلگداز قرأت کو کلام الہی کی عظمت کے ساتھ سننے لگے۔ پہلی رکعت کے بعد جب مولوی نعیم الدین دوسری رکعت میں الحمد شریف پڑھنے کے بعد سورہ رحمن پڑھنے لگے تو ان کے رنگین موبائل پر یہ گانا بجنے لگا ”جیون میں پیاتیرا ساتھ رہے، ہاتھوں میں تیرے میرا ہاتھ رہے۔“ (افسانہ فتنہ)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ فلم، ٹی وی اور موبائل نے ہماری اخلاقی قدروں کو ہی غارت نہیں کیا بلکہ ہمیں اپنوں سے بھی بیگانہ کر دیا۔ رشتے بے معنی بن کر رہ گئے۔ عورت جسے ہر دین دھرم میں مقدس شے سمجھا جاتا تھا اسی کے تقدس کو پامال کیا گیا۔ عورت لطف و لذت کا سامان بن کر رہ گئی۔ میگھ تھ جس نے اپنی زندگی شرافت و سادگی سے جینے کا عزم کیا تھا جو پرانی عورت کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے جو سماج میں پھیلی گند و غلاظت سے بے حد کچی اور پریشان تھے۔ معاشرے میں بڑھتی بے راہ روی اور فحاشی کو دیکھ کر وہ کڑھ کے رہ جاتے تھے۔ ایک بار وہ ٹہلنے کے لئے جب گھر سے نکلے تو قدم قدم پر حیا سوز مناظر دیکھ کر وہ اتنے

دکھی ہوئے کہ بھاگتے بھاگتے وہ ایک سینما ہال کے سامنے سے گزرے جہاں بورڈ پر لکھا تھا کہ یہ فلم صرف بالغوں کے لئے ہے۔ انہوں نے یہ سوچ کر ٹکٹ خریدا کہ شاید کوئی بھلتی گیان کی فلم ہوگی سو وہ فلم تھیٹر میں گھس گئے۔ فلم چلی تو پہلا منظر یوں تھا:

”پہلے منظر میں ایک شادی شدہ عورت کو ایک غیر شادی شدہ نوجوان سے محبت کرتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے منظر میں ایک تالاب میں ان دونوں کو بالکل عریاں حالت میں دکھایا گیا اور پھر تیسرا منظر ناقابل بیان۔ میگھ ناتھ سینما ہال میں تاریکی میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اب انہوں نے آنکھیں بند نہیں رکھی تھیں بلکہ کھلی آنکھوں سے برابر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ڈیڑھ سو کا ٹکٹ خریدا کر بالکونی میں جا کر بیٹھے تھے۔ تیسرے منظر نے ان کے پورے وجود میں بہت زیادہ حرارت پیدا کر دی تھی جو بعد میں آتش فشاں کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب میگھ ناتھ ہال سے باہر آئے تو وہ انتہائی مایوس تھے۔ ان کی آنکھوں نے آج جو کچھ دیکھا تھا وہ انہوں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا تھا۔ آج ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ان کے جسم میں جو اٹھل پٹھل ہوئی تھی وہ انہیں بار بار مایوس کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ کر سینما ہال میں آئے تھے اور کتنی قیمتی چیز لٹا کے یہاں سے جا رہے تھے۔ وہ یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے آج ان کی آنکھوں نے زنا کیا ہو۔“

(افسانہ آنکھوں کی عصمت دری)

کہانیوں کے یہ چند اقتباسات موجودہ دور کے ابھرتے ہوئے جوان سال افسانہ نگار مشتاق احمد وانی کے ہیں۔ مشتاق احمد وانی ایسے محبان اردو میں سے ایک ہیں جو اپنے لوح و قلم سے گلشن ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ ملک کے رسالوں اور جریڈوں میں تواتر سے چھپ رہے ہیں۔ وانی صاحب جنوں دشمن کے گرم خطے جنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو گرم علاقوں کے باسی ہوتے ہیں ان کا دماغ ہمیشہ گرم رہتا

ہے۔ وانی صاحب سے میں جب بھی ملتا تو انہیں بہت ہی مخلص اور ملنسار پایا۔ وہ مزاج سے بھلے ہی نرم اور ملائم ہوں مگر ان کا قلم اتنا ہی بیباک اور غیر جانبدار ہوتا ہے۔ وہ قلم اٹھاتے ہوئے کسی پاسداری کا خیال نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ اپنی تحریروں میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ وہ بے دھڑک اور بے خوف ہو کر اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں۔ وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں سے چشم پوشی نہیں کرتے بلکہ سودوزیاں کی پرواہ کئے بنا انہیں بے نقاب کر دیتے ہیں۔ یہ سچائیاں تلخ اور تکلیف دہ سہی مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہوتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں رشوت خوری کی علت و با کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اقربا پروری کا سماج کے ہر شعبے میں بول بالا ہے۔ حق تلفی ایک عام سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ اس حق تلفی کا شکار ہمیشہ نچلا طبقہ ہوتا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ کتنا بڑا المیہ یہ ہے کہ قابل اور مستحق امیدوار پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جبکہ نالائق اور غیر مستحق امیدوار اونچے اونچے عہدوں کے لئے چنے جاتے ہیں۔ اس استحصال، نا انصافی اور حق تلفی پر وانی صاحب یوں طنز کرتے ہیں:

”نکل کانت جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکلیہ مفت نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پر و فیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی۔ تجھے پتا ہونا چاہئے دولاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔ اچھا یہ بتا کہ دارالعلوم کا سرپرست اعلیٰ بھی تجھے تیرا حق نہیں دلا سکا۔ کہتے ہیں دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے۔“ (افسانہ اندر کی باتیں)

وانی صاحب نے روایتی موضوعات کو ہی اپنے فکر و فن کا محور نہیں بنایا ہے بلکہ ان کی طائرانہ نگاہیں حالات حاضرہ کے سلگتے مسائل میں موج جو رہتی ہیں ان کے یہاں موضوع کا تنوع اور فکر کی بولکھنی ملتی ہے۔ ذات پات اور بھید بھاؤ ایک کوڑھ کی طرح ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا ہے۔ مشتاق وانی ایک آزادانہ سوچ اور سیکولر ذہن رکھتے ہیں۔ وہ چھوت چھات اور اس کے منفی اثرات سے بھلی بھانتی واقف ہیں اس لئے وہ پورے شد و مد

کے ساتھ اس بدعت کے خلاف کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔

”در اصل جیون داس بچپن سے ہی آزاد خیال اور باغیانہ طبیعت کا حامل تھا۔ وہ دھرم کرم اور ذات پات میں بے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلنی ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضائے بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک اور ایک منہ، ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں۔ بالکل سرخ رنگ کا تو پھر یہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی بدھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا یہ انسان کیوں؟“ (افسانہ باغی)

ان کی تحریریں دل کو چھنچھوڑتی ہیں۔ شعور کو ہمیز کرتی ہیں، سینے میں جوش بھرتی ہیں اور فکر کو نئی سمت اور اثر ان کی طرف لے جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

”میرے دیش میں بسنے والے بھائیو، بہنو اور بزرگو! ہم سب انسان ہیں مگر مختلف فرقوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے کوئی مسلمان، کوئی سکھ، کوئی بدھ اور کوئی جین کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری ذاتوں میں ہم بالکل سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ ان مذہبوں، دھرموں اور ذاتوں کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ ہمارا ملک ترقی کے بدلے انتہائی تنزلی کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔ اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن اور خوشحالی قائم ہو ہمارا ملک ہر طرح سے ترقی کرے اور ہمیں صحیح زندگی کا لطف حاصل ہو تو اس کے لئے آپ کو میری ایک نصیحت پر عمل کرنا ہوگا وہ یہ کہ آپ تمام دھرموں، مذہبوں، ذاتوں، رسموں اور رواجوں سے اپنا دامن

حیات چھڑا لیجئے۔ آپ کا کوئی بھی دین دھرم نہ ہو نہ کوئی ذات ہو بلکہ آپ صرف انسان بن کے رہیں۔ کوئی بھی مذہبی پابندی نہ ہو کیونکہ مذہبی جنون ہماری تمام آزادیاں اور عیاشیاں ختم کر دیتا ہے۔“

وہ ایک ماہر جراح کی طرح اپنے قلم کے نشتر سے سماج میں پل رہے ان پھوڑوں کو چیر ڈالتے ہیں جن میں فاسد مواد بھرا پڑا ہے۔ وہ ناصح بن کر ہمیں نیچر نہیں دیتے بلکہ جو کچھ بھی کہنا ہوتا ہے وہ اپنی کہانی کے کردار سے بڑے سلیقے سے کہلواتے ہیں۔ ان کے افسانے بڑے سرل اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنے افکار و احساسات اپنے قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ موضوع اور کشمکش کے اعتبار سے وہ سادگی و پرکاری، ایجاز و اختصار کے ذریعے اپنے افسانوں کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔

انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ اپنی کامیابی اور ناکامی کے لئے خدا کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اچھا ہوا تو خدا نے کیا۔ برا ہوا تو الزام خدا پر ہی ڈالا جاتا ہے۔ مادہ پرستی اور نفسانی خواہشات نے آدمی کو بڑا خود غرض، بے ایمان اور ریاکار بنا دیا۔ آج ہر شخص کی زندگی میں الجھاؤ ہے، بکراؤ ہے اور وہ انہیں پیچیدگیوں کے پیچ و خم میں الجھا ہوا ہے۔ دانی صاحب معاشرے کی المناکیوں کو بڑی جی داری کے ساتھ برہنہ کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔

”خواتین و خطرات! آپ میں سے تقریباً بہت سے افراد کا کہنا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرواتا ہے، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دن رات جو کروڑوں ٹن شراب لی جاتی ہے، لاکھوں زنا کے اڈے قائم ہیں، اس کے علاوہ رشوت، ظلم، استحصال، چیزوں میں ملاوٹ، ہیرا پھیری، دھوکہ، فریب، حق تلفی، ڈاکہ زنی، غنڈہ گردی، شکم مادر میں بیٹیوں کا قتل، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے چشم پوشی، غرضیکہ یہ سب کچھ کیا خدا ہی کرواتا ہے؟ میں اس اہم سوال کا جواب چاہتا ہوں؟“ (افسانہ ایک اہم سوال)

مشتاق احمد دانی کے افسانوں کے زیادہ تر کردار متوسط طبقے کے معاشرتی ماحول

سے مستعار ہیں۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کا بڑی گہرائی سے نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔ جیسے ”بابا کو کچھ ہو گیا ہے“ وغیرہ۔ ان کے کچھ افسانوں کے عنوان مجھے بڑے غیر روایتی اور عجیب سے لگے۔ مثلاً ”جسم خور کیڑا“، آنکھوں کی عصمت دری، بابا کو کچھ ہو گیا ہے، ان عنوانوں سے لگتا ہے کہ جیسے آپ ابن صفی کی کہانیاں پڑھنے جا رہے ہوں۔ وانی نے اب تک جتنے بھی افسانے لکھے وہ سارے حقیقت پسندانہ رہے ہیں۔ رومانیت سے لگتا ہے انہیں پرہیز ہے۔ اب تک مجھے ان کا کوئی بھی رومانی افسانہ پڑھنے کو نہیں ملا۔ وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ان کی زبان کی سادگی اور شگفتگی قاری کے دل کو موہ لیتی ہے۔ ان کے بیانیہ میں بلا کی رعنائی اور فصاحت ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کو موتیوں کی طرح چن لیتے ہیں اور پھر انہیں ایک لڑی میں پرونے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

”نوری مجھے وقت کے گزرنے کا احساس اندر ہی اندر نوچتا اور جھنجھوڑتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تنہا کرنے لگتا ہوں کہ کاش وقت کی رفتار تھم جائے اور تغیر نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے۔ میں جوان رہوں اور تم بھی جوان رہو۔ ہم دونوں عشق کی ڈور میں یوں ہی بندھے رہیں کہ یہ ڈور کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔ مگر یہ سب کچھ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وقت کے آگے بے بس و مجبور ہیں کیونکہ وقت جیسے دیو ہیکل کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹک سکا ہے۔ اس نے آج تک سب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ یہ بڑی بے دردی سے سب کو روندنا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ سچ کہتا ہوں، شادی کے موقع پر تم بہت حسین و جمیل تھیں۔ شادی کے بعد تمہارا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ تمہاری لمبی گھنیری زلفوں میں چاندی جیسی سفیدی آگ آئی ہے۔ تم اس سفیدی کو سیاہی میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہو مگر وقت صداقت کی لاشی سے ہر کھرے کھوٹے کی نشاندہی کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ تمہارے موتی جیسے دانتوں میں نیلا پن در آیا ہے۔ لگتا ہے

انہیں اندر ہی اندر کوئی کیڑا برباد کرنے میں لگا ہے۔ تمہارے جسم کی وہ تمام دلکش رعنائیاں اور وہ تمہارا انداز دلربائی آخر کہاں گیا؟ نوری ہم سب ذمہ دار یوں کے بوجھ تلے اس قدر دب جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ کا بھی علم نہیں رہتا۔ وقت نے ہمیں کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے اور آخر کار ہمارا انجام کیا ہوگا ذرا سوچو تو سہی۔ دیکھو تم میری باتیں سن کر مایوس ہو رہی ہو۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں، یہ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگ رہا ہوں؟“ (افسانہ ’جسم خور کیڑا‘)

’جسم خور کیڑا‘ ایک جذباتی کہانی ہے جس میں ڈھلتی عمر کا احساس اور پیش آئندہ سختیوں کا تصور غلام عباس اور اس کی بیوی نوری کو خوفزدہ کرتا ہے۔ اس میں انسانی قدروں کی پامالی کا نوحہ ہے۔ بچوں کی بے رخی اور بدلتے حالات کی شگرمی کا البہ بیان ہے۔ یہ ایک کڑوی سچائی ہے کہ آج کل کے بچے ماں باپ کے بوڑھے ہونے پر انہیں اپنے لئے بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ انہیں یا تو اپنی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں یا انہیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

”بیٹا میرے تین بیٹے ہیں، بیٹی کوئی نہیں ہے تینوں کو بڑے ناز و نعم سے میں نے پڑھایا لکھایا بڑا بیٹا فوج میں بریگیڈیر ہے، دوسرا تحصیلدار ہے اور تیسرا آپ کے شہر کا سب سے بڑا بزنس مین ہے۔ بڑے بیٹے کی شادی کی تو کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنی بیوی کے ہمراہ مدراس چلا گیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ بھی ہم سے الگ ہو گیا اور تیسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ تین سال تک ہمارے ساتھ رہا۔ اس کے دو بچے ہونے کے بعد وہ اور اس کی بیوی ہم سے نفرت کرنے لگے محض اس بات پر کہ مجھے رات کو کھانسی آتی تھی اور میری کھانسی کی وجہ سے ان کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔ چنانچہ تین سال کے بعد وہ بھی ہم سے الگ ہو گئے۔ میری کروڑوں کی پراپرٹی پر جب میرے بیٹے لڑنے جھگڑنے لگے تو میں نے سب

کچھ ان میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے میری ہر چیز کو سنبھال لیا لیکن ہم بوڑھوں کو انہوں نے نہیں سنبھالا۔ وہ ہمیں تقسیم نہیں کر سکے۔ بیٹے ہم تو چتا تک ایک دوسرے کے ساتھ جائیں گے میری بوڑھی کملاوتی بڑی مشکل سے میرے اور اپنے لئے دو وقت کا کھانا تیار کرتی ہے۔ بیٹا شاید ہم دونوں بہت جلد وردھ آشرم میں داخلہ لیں گے۔ کم از کم زندگی کے کچھ دن کسی کی دیکھ بھال میں تو گزر جائیں گے۔“

(افسانہ ”جسم خور کیڑا“)

افسانہ پانچ سال کا بن باس سب سے طویل افسانہ ہے۔ اس کا بیانیہ بڑا سپاٹ ہے۔ دانی صاحب نے ایک روایتی قصہ گو کی طرح ایک طویل قصہ بیان کیا ہے۔ زلفاں بی بی کا والد امان اللہ اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر شہر میں آ کے بستا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ زلفاں بی بی جو کہ سب سے بڑی بیٹی ہے، ایم ایس سی بائنی کر رہی ہوتی ہے۔ جب اسے اپنے آبائی گاؤں میں پانچ سال کے لئے رضا کارانہ طور پر معقلہ بن کر جانا پڑتا ہے تو شہری ماحول کی پروردہ زلفاں بی بی گاؤں جانے کے نام سے ہی کانپ جاتی ہے جبکہ اس کا باپ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور اسے اپنے ساتھ اپنے آبائی گاؤں لے کر جاتا ہے۔ ایک پچھڑے ہوئے علاقہ میں کن کن مشکلات سے اسے جھوٹا پڑتا ہے اس کا ذکر افسانہ نگار نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ زلفاں بی بی اپنے حسن سلوک سے پورے گاؤں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ افسانہ نگار نے جس فصاحت سے اس کہانی کو بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ خاص طور سے جس طرح ماحول کی منظر نگاری کی گئی ہے ایسا لگتا ہے جیسے ایک ایک منظر فلم کی ریل کی طرح ہمارے سامنے چل رہا ہے۔ افسانہ نگار نے ماحول کی جس طرح عکاسی کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کہانی کار کے تخیل کی دھند میں سے اس کہانی کا جنم نہیں ہوا ہے بلکہ کہانی کار نے اس ماحول کی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ کہانی کا بیانیہ بڑا سرل اور رواں ہے۔ بس ایک ہی کمی مجھے اس کہانی میں کھٹکی۔ اس کے کلائمکس کا پہلے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہانی کا کلائمکس کچھ اس طرح ہونا چاہئے تھا جو قاری کو چونکا دیتا۔ بہر حال اس کہانی میں گاؤں کی مٹی کی مہک ہے جو قاری کو شرب اور کر سکتی ہے۔

مشاق احمد وانی کا بیانیہ انداز بھی انسانی رشتوں کے اتار چڑھاؤ کو پیش کرتا ،
 نظر آتا ہے۔ وہ انسانی استحصال کے مخالف ہیں۔ ان کی نظر مستقبل پر بہت گہری ہے۔ ان
 کے کردار ہمارے اطراف سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ میں وانی صاحب کو ان
 کے آنے والے مجموعے ”اندر کی باتیں“ کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔



دیکھ بھیک

(غازی آباد، یوپی)

09868271199

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی 'اندر کی باتیں'

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'اندر کی باتیں' منصفہ شہود پر نمودار ہو رہا ہے۔ قریب بیس برس سے وہ قارئین کو اپنے افسانوں سے محظوظ کرتے آ رہے ہیں اور تاحال ان کا قلم فعال ہے۔ انھوں نے بحیثیت افسانہ نگار، نقاد اور محقق برصغیر ہند و پاک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں میں اپنا لوہا منوایا ہے جو نہ صرف ان کے لیے بلکہ ریاست جموں و کشمیر کے لیے بھی باعث افتخار ہے۔

ڈاکٹر وانی ریاست جموں و کشمیر کے دور دراز گاؤں بہوتہ، ضلع ڈوڈہ میں ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے اور بی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مارچ ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے اور بی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مقالہ بعنوان 'تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران' رقم کر کے جموں یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس کے باوجود تعلیمی برقرار رہی۔ اس لیے انھوں نے مزید موقی برآمد کرنے کے لیے بحر علم میں پھر سے غوطہ لگایا۔ بڑی تگ و تاز اور محنت کے بعد انھوں نے 'اردو ادب میں تانیثیت' کے عنوان سے مبسوط مقالہ لکھا اور وہ ہیکلہنڈ یونیورسٹی بریگیٹ سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔ ادبی میدان میں مشتاق احمد وانی نے افسانہ نگاری سے شروعات کی اور پھر تحقیق و تنقید کی طرف بھی مائل ہو گئے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔

☆ افسانوں کے مجموعے: (۱) ہزاروں غم [افسانے، ۲۰۰۱ء: ۲] میٹھا زہر

[افسانے، ۲۰۰۸ء]

☆ تحقیقی و تنقیدی تصانیف: (۱) تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران

[۲۰۰۲ء: (۲) آئینہ در آئینہ [۲۰۰۴]

(۳) اعتبار و معیار [۲۰۱۱ء: (۴) اردو ادب میں تانیثیت [۲۰۱۳ء: (۵) شعور

بصیرت [۲۰۱۴ء]

موصوف کی نگارشات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انھیں جتنی دسترس افسانہ نگاری پر حاصل ہے اتنا ہی کمال انھیں تحقیق و انتقادات میں بھی حاصل ہے۔ پہلی صنف کا تقاضا ہے کہ افسانہ نگار فرد اور سماج کے مختلف گوشوں کا عمیق مشاہدہ کرے جبکہ دوسری صنف کا تقاضا ہے کہ ادیب مطالعے میں غرق رہے اور ادب کے ہر گوشے پر کڑی نگاہ رکھتا ہو۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ہر دو شعبوں میں سرخ رو ہو چکے ہیں۔ جہاں تک ان کی افسانہ نگاری کا سوال ہے، ہزاروں غم سے لے کر اب تک وہ ایک لمبا سفر طے کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکر و نظر کا ارتقا صاف نظر آتا ہے۔ موضوعات میں بولقلمونی، کرداروں میں تنوع اور اسلوب میں اثر انگیز لب و لہجہ ملتا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے جن دنوں ہاتھ میں قلم اٹھایا اس وقت جدیدیت کا سورج غروب ہو چکا تھا، ادیب علامتی و استعاراتی چیتاں سے فرار پانے کے متمنی تھے اور ترسیل کے لیے سے چھکارا پانے کے لیے کہانی میں 'کہانی پن' لوٹ آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں قاری سے کھل کر براہ راست مخاطب ہوئے اور انھوں نے اظہار خیال کے لیے بیانیہ کو منتخب کیا۔ چنانچہ وہ ایک دور دراز پسماندہ علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے غریب اور پسماندہ لوگوں کی نمائندگی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس حد تک ان کی تحریروں میں ترقی پسندی کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھر بھی تامل نہیں ہے کہ وہ کسی مکتب فکر کی پیروی نہیں کرتے۔ وہ صرف اور صرف حقیقت پسندی کو اپنائے اپنی ایک انفرادی ڈگر پر گامزن ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی خدا پرست اور صوم و صلوة کے پابند ہیں۔ انھیں اپنے دین سے بے حد لگاؤ ہے اور خدا کے انصاف، رحم اور فیوض و برکات پر پورا بھروسہ ہے۔ اسلامی اقدار کے وہ ولدادہ ہیں اور ان میں نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ انھیں ہم عصر زندگی کی

بے راہ روی، قدروں کی پامالی، انفرادی بددیانتی اور اجتماعی تخریب کاری سے نفرت ہے اس لیے ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ بائیں ہمہ ان کے افسانوں میں اکثر ان کا نظریہ حیات حاوی ہو جاتا ہے، متن پر قلم کار غالب آ جاتا ہے اور حقیقت پسندی کی جگہ مثالیت پسندی لے لیتی ہے۔ افسانہ اندر کی باتیں، پانچ سال کا بن باس اور چہرہ چھپائے لوگ اس رجحان کی چند مثالیں ہیں۔ تینوں افسانوں میں افسانہ نگار کی معلم گری اور نامحاذہ فطرت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نمونے کے لیے چہرہ چھپائے لوگ میں راج محمد کی اپنی بیٹی کو دی گئی نصیحت ملاحظہ کیجیے۔

”میری بیٹی! میری نصیحت آمیز باتوں پر عمل کرنا، بیٹیاں گھروں کی زینت اور رحمت ہوتی ہیں لیکن جب ان کے قدم بہک جاتے ہیں تو ماں باپ کے لیے زحمت اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم علم کی شمع بنو، رونق محفل نہ بنو۔ تم کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرو لیکن تمہارے رخ پر نقاب رہے تاکہ تم پر کسی غیر محرم کی نگاہ نہ پڑنے پائے۔“

افسانوں کے مجموعے اندر کی باتیں میں بارہ افسانے شامل ہیں جو ہم عصر معاشرے کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ افسانہ ”جسم خور کھڑا“ کا عنوان سن رسیدگی اور طفیلیت کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں تین آسودہ حال بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی دولت مند ضعیف العمر لالہ مدن گوپال اور اس کی شریعتی کووردھ آشرم میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ افسانے کو ایک غریب جوڑے کی عینک سے دیکھا گیا ہے جس سے نہ صرف کہانی میں تخالف پیدا ہوا ہے بلکہ ٹریٹمنٹ میں انوکھا پن در آیا ہے۔ جاں نثار جوڑے، غلام عباس اور نوری، کے کردار بڑی ہنر مندی سے منعکس کیے گئے ہیں۔ افسانہ اندر کی باتیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی افسانہ نگار کی نجی زندگی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر وابستہ ہے۔ افسانے میں ایک ہونہار، محنتی اور ذہین امیدوار کو اسٹنٹ پرو فیسری کے لیے اس لیے نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ وہ صدر شعبہ کی حرم زر اور ہوس نفس کو پورا نہیں کر پاتا۔ اس کی جگہ ایک ناقابل اور تابکار مگر زمانہ ساز امیدوار کو چن لیا

جاتا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے موجودہ تنزل یافتہ معاشرے کو درشتاتا ہے۔ افسانے کا ناامید کردار، مکمل کانت اس حالت سے فرار پانے کی سوچتا ہے۔ اس کو کئی راستے سوچتے ہیں جیسے خودکشی، دہشت گردی یا پھر ساری کتابوں کو دور یا برد کر کے اپنی انفلکچول قوت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا مگر اس کا دوست اسے روکتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اس سے بہتر ہے ایشور کی شرین میں چلے جانا کیونکہ وہ بڑا کارساز ہے۔ افسانے میں بطور ڈرامائی انصاف چترنجن باسو، جو مکمل کانت کے مستقبل کو برباد کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے، آخر خروش کوڑھ کا شکار ہوتا ہے۔ افسانہ چہرہ چھپائے لوگ میں موجودہ دور کے تعلیمی اداروں اور نئی نسل کی بے ضابطگیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیسے تعلیمی ادارے نظر بازی اور عاشقی کے اڈے بن چکے ہیں اور اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

بابا کو کچھ ہو گیا ہے مختصر افسانہ ہے اور افسانچہ کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ افسانے میں ایک فرض شناس مدرس کو زندگی کی المناک حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ اس وقت حیران ہو جاتا ہے جب وہ ایک ایسے بابا کو دیکھتا ہے جو ایک طرف لوگوں کو رام کتھا سنا رہا ہے اور دوسری طرف شراب پی کر راستے پر لڑھکا ہوا مل جاتا ہے۔ ایسا ہی مختصر افسانہ ایک اہم سوال ہے جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ برے کام کا برا نتیجہ ہوتا ہے۔ افسانے میں بے ایمان بدرالدین کی ساری پونجی اس کی غیر حاضری میں گھر سے چوری ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ خدا کر داتا ہے اس لیے برے کام بھی وہی کر داتا ہوگا؟ یہ سوال ہزار ہا برس سے دانشوروں کو پریشان کرتا رہا ہے مگر آج تک کوئی معقول جواب نہیں مل سکا۔ 'نقذ' بھی مختصر افسانہ ہے جس میں مولوی نعیم الدین کی اس وقت فضیلت ہوتی ہے جب نماز ادا کرتے وقت خود اس کی جیب میں رکھے ہوئے موبائیل پر فلیش گاٹا بطور کارٹیون بچ اٹھتا ہے۔ مطلب یہ کہ بظاہر پارسا لوگ بھی اس زمانے میں زندگی کی لطافتوں سے کنارہ نہیں کر پاتے۔

پانچ سال کا بن باس ایک کرداری افسانہ ہے اور حاصل مجموعہ بھی۔ اس افسانے میں ایک نیک، عینیت پسند، ارادے کی پکی اور اولوالعزم تعلیم یافتہ لڑکی، زلفاں بی

بی اپنے والد کی رہنمائی کے باعث آبائی گاؤں میں اجالا کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کرتی ہے اور ہر اس رکاوٹ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے جو اس کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ زلفاں بی بی اس وقت غیر شعوری طور پر اپنی ایمان داری کا ثبوت دیتی ہے جب وہ غیر حاضر ہو کر حاضر لگائے جانے پر اعتراض کرتی ہے۔ آخر کار کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ زلفاں کا کردار حالانکہ خیالی اور مثالی ہے مگر قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور نئی نسل کی لڑکیوں کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس افسانے میں زلفاں کے والد امان اللہ کا کردار بھی بہت اہم ہے کیونکہ وہ اپنی بیٹی کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کو انسانی ہمدردی، قربانی اور ایثار کا درس دیتا ہے۔ اسی طرح 'باغی' ایک ایسے براہمن زادے کی کہانی ہے جو سماجی بندشوں سے بغاوت کر کے ایک نیچی ذات کی لڑکی سے شادی کر کے بنیاد پرست قوتوں سے لوہا لیتا ہے۔ اس افسانے میں بھی کہیں کہیں افسانہ نگار کی ناصحانہ حس جاگ اٹھی ہے۔

'آنکھوں کی عصمت دری' میں ایک جبری و انضباطی ماحول میں پلا گئی پینڈت یوں تو زندگی کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے مگر معاصر نمائشی فضا کی رنگینیوں میں کھو کر اپنی جہلی ضرورتوں پر قابو پانے میں ناکام رہتا ہے اور انجام کار ذہنی صحبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جنسی موضوع پر لکھا گیا ایک اور خوبصورت افسانہ 'چھپا سانپ' انسانی نفسیات کے مشاہدے پر دال ہے۔ افسانہ تذوق محرمات پر رقم کیا گیا ہے جس میں ایک مذہبی مقتدا پینڈت رتن شاستری اپنی تمام تر خوبیوں اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے باوجود اپنی بہو میناکشی سے منہ کالا کرتا ہے اور اس کی خود کشی کا سبب بن جاتا ہے۔ نتیجتاً پولیس اس کو حراست میں لیتی ہے اور اس کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ افسانہ 'باہر اور اندر کا منظر' موجودہ زمانے کے شہرت یافتہ دکانداروں کی پول کھولتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ آج کل نام آوری دیانت داری سے نہیں بلکہ تشہیر کاری سے ملتی ہے۔ افسانے میں ایک مشہور حلوائی سیوانا تھکی دکان کا ایکس رے پیش کیا گیا ہے کہ کیسے اس کی دکان پر بننے والی مٹھائیوں میں ملاوٹ ہوتی ہے اور حفظ صحت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ افسانہ 'سُرگوشی' ایک لطیف اور ہلکا پھلکا افسانہ ہے جس میں باہمی عشق و محبت میں سرشار جوڑا اعتبار کی عدم موجودگی کا مظاہرہ کرتے

ہیں اور لڑکی معمولی سی بات پر اپنے معشوق پر شک کرنے لگتی ہے۔

مجموعے میں افسانہ نگار نے کردار نگاری کی جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ وہ کردار کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ابھارنے کی ہر دم کوشش کرتے ہیں تاکہ کردار نکھر کر قاری کے سامنے آئے۔ مجموعے میں جہاں ایک طرف 'اندر کی باتیں' کا کل کانت، 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے' کا فردوس احمد اور 'پانچ سال کا بن باس' کی زلفاں بی بی جیسے مثبت کردار ملتے ہیں وہیں ایک اہم سوال 'کابدرا الدین اور 'چھپا سانپ' کا پنڈت رتن شاستری جیسے منفی کردار بھی ملتے ہیں۔ عام طور پر ان کے کردار حرکی اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں جو واقعات کے ساتھ خود کو ڈھالتے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے مثلاً 'پانچ سال کا بن باس' کرداری افسانوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں کیونکہ ان میں مرکزی کردار مدار بن جاتا ہے اور واقعات اس کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ زلفاں بی بی کا کردار بہت ہی فکر مندی کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔

افسانہ نگار نے کئی افسانوں میں مختلف مناظر کی تصویر کشی بڑی ہنروری سے کی ہے جیسے 'اندر کی باتیں' میں سات ستارہ ہوٹل کا بیان، 'پانچ سال کا بن باس' میں گاؤں اور سکول کی حالتِ زار کی عکاسی یا پھر 'سرگوشی' میں پارک کا نظارہ۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں بیانیہ کے علاوہ حسب ضرورت مکالمے بھی ملتے ہیں جو کردار کی شخصیت کا آئینہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ انھیں زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے اور وہ سلیس، رواں اور شگفتہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ علامتوں اور استعاروں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنی بات کھل کر کہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ ”سر! انسان کو نیک نیتی سے نیک کام کرنا چاہیے، میں دیس اور بھیس میں بدلاؤ چاہتی ہوں، لہذا ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اپنی استعداد کے مطابق کوشش کریں گے۔ (پانچ سال کا بن باس)

☆ ”شاعری نہیں کر رہی ہوں، سچ کہتی ہوں۔ وقت اور مسائل حیات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ گردشِ روز و شب نے ہم سے ہمارا بچپن اور لڑکپن چھین لیا ہے۔ میری سہیلیو! جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔“ (پانچ سال کا بن باس)

☆ وہ چاہتا تھا کہ تمام لوگ مذہبوں، دھرموں، ذات پات، چھوت چھات اور ریتی رواج کو چھوڑ کر انسانیت کے رنگ میں رنگ جائیں کیونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دنیا میں انسان کا خون سب سے زیادہ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر بہایا گیا ہے۔ (باغی)

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی ایسے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات میسر نہیں۔ بچپن کی ان یادوں کی خلش ان کے سینے میں آج بھی چھپی نظر آتی ہیں۔ ایسے پس منظر میں ان کی زندگی مسلسل کشش کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے عزم و استقلال کے ساتھ تعلیم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں جس کے لیے انھیں کافی مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ ان کے افسانوں میں ذاتی تجربات اور وسیع مطالعہ شیرہ انگور کی مانند پکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسے تہذیب یافتہ سماج کا تصور کرتے ہیں جس میں انسانیت ہو، ہمدردی ہو اور خوشحالی ہو۔ ان کا یہ رویہ ان کے قلم کی طاقت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی آئندہ بھی اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں گے اور خوب سے خوب تر افسانے قارئین کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔



معین الدین عثمانی

(جگاؤں، مہاراشٹر)

09921299749

’اندر کی باتیں‘ بیانیہ کا واضح اشاریہ (تعارفی مطالعہ)

اردو ادب میں افسانہ مغربی دروازے سے داخل ضرور ہوا مگر اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں بیہیم کی مٹی میں اپنی جڑیں پیوست کر دیں اور اب داستان گوئی، قصہ خوانی سے لے کر رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت، مابعد جدیدیت کا دور دیکھنے کے بعد پھر اپنی ابتدائی کوشش کو اپناتے ہوئے مابعدی کیفیت کے ساتھ بیانیہ کی طرف مراجعت کی ہے۔ افسانے کے اس سفر میں کئی چھوٹے بڑے قافلہ سالاروں نے قدم سے قدم ملا کر اس کا رواں کو آگے بڑھایا۔ مجھے خوشی ہے کہ افسانہ نگاروں کے قافلوں کی اس بھیڑ میں مشتاق احمد وانی نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ ممکنہ نقوش چھوڑے ہیں۔ جو ادب کی دنیا میں انہیں آباد رکھیں گے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی مسائل سے عبارت ہے۔ آفرینش سے لے کر موت تک انسان مختلف مسائل سے جھو جھتا ہے۔ بعض مسائل سے نبرد آزما کی میں اسے کامیابی ملتی ہے تو بعض میں ناکامی۔ اس کامیابی و ناکامی کو جھو جھنے میں انسان کو مختلف تجربات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عام طور پر یہی ہمارے اردو افسانے کے موضوعات ہیں۔ یہ تجربات ذاتی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں یا پھر مطالعہ و مشاہدے کی دین بھی۔ ذاتی نوعیت کا کوئی تجربہ جب کوئی فنکار بیان کرتا ہے تو اس کی تاثیر میں رشوت درآتی ہے اور تحریر کا رنگ و روپ نکھر جاتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس قوت احساس کے اظہار کی صلاحیت

زیادہ ہے وہ اپنے عمیق مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر اوروں کے تجربات اس انداز سے بیان کر جاتے ہیں کہ جگ بیتی پر آپ بیتی کا گمان ہونے لگتا ہے کیونکہ اس میں صاحب تحریر کا کرب شامل ہو جاتا ہے۔

انسانی زندگی میں روزگار کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی حصولیابی کے لئے لوگ نت نئے تجربات بروئے کار لاتے ہیں۔ غلط طریقے سے حاصل کردہ چیز کا انجام غلط ہوتا ہے کہ یہ فطرت کا اصول ہے۔ مستحق ہونے کے بعد مقصد کی عدم دستیابی پر جو ذہنی اذیت ہوتی ہے اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا ہے جس پر اس طرح کا کوئی سانحہ گزرا ہو۔ اس طرح کے عمومی مسائل اور موضوعات سے اردو فکشن کا دامن بھر پڑا ہے اس کے باوجود بھی ہمارے موجودہ فنکاروں کی تحریروں کا اس خزانے میں اضافہ روز افزوں ہے۔

’اندر کی باتیں‘ عنوان کے تحت جناب مشتاق احمد وانی کا افسانہ پیش نظر ہے۔ افسانہ کی نوعیت جدا گانہ اس لئے نہیں ہے کہ موضوع تو اس کا بھی روزگار سے متعلق ہے مگر کہانی کو جو ٹریٹمنٹ انہوں نے دی ہے وہ ان کی تحریر کو سب سے الگ اور منفرد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مشتاق احمد وانی موجودہ عہد کے معتبر فنکار ہیں ان کی تحریروں ملک و بیرون ملک کے معتبر رسائل میں شائع ہوا کرتی ہیں۔ اگرچہ کہ ان کا انداز نہایت سادہ ہے مگر کہانی بننے کے ہنر سے ان کی واقفیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ کہانی کے فنی لوازمات کو نہ صرف یہ کہ سمجھتے ہیں بلکہ انہیں برتنے میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کا تعلق ایسی سرزمین سے ہے جسے ماضی میں جنت نشاں کہا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہاں چین کی دیوی کا راج تھا۔ آج مختلف وجوہات کے سبب حالات بدلے ہوئے ہیں اور ایسے ناگفتہ بہ حالات میں بھی لوگ زندگی جینے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تو مشتاق احمد وانی اپنی مٹی کا قرض ان تحریروں کے ذریعہ اتار کر امن و آشتی کا پیغام دے رہے ہیں۔ جس کی تعریف نہ کرنا انصافی کے مترادف ہوگا۔

مذکورہ کہانی کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ کہانی میں درج واقعہ کی اذیت کو انہوں نے خود جھیل لیا ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی ہے مگر تحریر میں درآئی ہے چینی اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ دراصل فنکار کی زندگی اسے ہر لمحہ بے

چین رکھتی ہے اور یہ بے چینی جب لفظوں کے ذریعہ ہمارے سامنے آتی ہے تو گرفت میں لے کر ہی دم لیتی ہے۔

متذکرہ کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ مرکزی کردار مکمل کانت، ایک تعلیم یافتہ بے روزگار شخص ہے جو اپنے قریبی دوست نریش رانا جو پیشے سے ہوٹل مالک ہے کو اپنے ساتھ ہوئی نائنسانی کی روداد الم بیان کرتا ہے۔ نریش رانا جو اس نائنسانی میں اتفاقی طور پر چترنجن باسو کے ساتھ شریک تھا مکمل کانت کو اصل حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مشتاق احمد دانی نے اندر کی باتیں میں باہر کی باتیں دہرائی ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی کہانی اس لحاظ سے کامیاب ہے کہ اس میں کہانی کے پورے لوازمات موجود ہیں۔ منظر نگاری، کردار، مکالمات اور مختصر تحریر کی آمیزش نے کہانی کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔



ڈاکٹر پرویز شہریار (نئی دہلی)

09910782964

مشتاق احمد وانی کے افسانے تہذیبی بحران پر تازیانے

مشتاق احمد وانی گذشتہ دو دہائیوں سے افسانہ نگاری کے میدان میں کافی فعال رہے ہیں۔ اس دوران ان کے دو افسانوی مجموعے پہلا ۲۰۰۱ میں ”ہزاروں غم“ کے نام سے اور دوسرا ۲۰۰۸ میں ”میٹھا زہر“ کے نام سے منظر عام پر آنے کے بعد خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مشتاق احمد وانی نہ صرف یہ کہ اردو ادب میں اپنی ایک پہچان بنانے میں مصروف عمل ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مشتاق احمد وانی کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام سرعت سے بنا رہے ہیں تو میرا خیال ہے کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اب تک وہ نصف درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف اور تالیف کر چکے ہیں۔ تخلیقی ادب کے علاوہ تحقیقی اور تنقید کے اقلیم میں بھی قابل ذکر اضافہ کر چکے ہیں۔ بلکہ اب تو خود ان پر بھی دانش گاہوں میں تحقیقی مقالات لکھے جا رہے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے دو افسانوی مجموعوں کے بعد سے اب تک کیے بعد دیگرے کئی افسانے سپرد قلم کیے ہیں اور اب ان کے تازہ افسانوں کا تیسرا مجموعہ ”اندر کی باتیں“ کے عنوان سے دستیاب ہو رہا ہے۔ اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں:

- (۱) اندر کی باتیں
- (۲) پانچ سال کا بن باس
- (۳) آنکھوں کی عصمت دری
- (۴) سرگوشی

(۵) بابا کو کچھ ہو گیا ہے!

(۶) ایک اہم سوال

(۷) جسم خور کیزا

(۸) فتنہ

(۹) باغی

(۱۰) چھپا سانپ

(۱۱) باہر اور اندر کا منظر

(۱۲) چہرہ چھپائے لوگ۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں عام طور سے تہذیبی بحران پر تازیا نے اور اخلاقی انحطاط کے خلاف صدائے احتجاج دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آج بھی اردو میں ایسے کئی افسانہ نگار موجود ہیں جو ادب سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا جانتے ہیں۔ سماجی تفاعل سے پیدا ہونے والی کسی بھی چیز کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ ادب کا بھی ایک مقصد ہے۔ لہذا فن پاروں کو بھی مشتاق احمد وانی اصلاح معاشرہ کا آلہ کار سمجھتے ہیں اور اس کے ذریعے ماحول میں پنپنے والے ضرر رساں جراثیموں کے انسداد کے لیے اپنی نوکِ قلم سے نشتر کا کام لیتے ہیں۔

اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ افسانہ ”اندر کی باتیں“ میں مشتاق احمد وانی نے یونیورسٹیوں میں کسی وبا کی طرح تیزی سے پھیلنے والی بیماری یعنی Corruption اور Grafting کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اسے جڑ سے ختم کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں ذہین اور ایماندار پروفیسروں کی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود رشوت خوری اور بدعنوانی ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کرتی جا رہی ہیں۔ ہمارے درالعلوم بھی ہمارے سماج کا ہی ایک انتہائی فعال ادارہ ہوتا ہے لیکن بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ جن تعلیمی اداروں کو بددیانتی کے جرائم سے پاک ہونا چاہیے تھا آج وہ ادارے ہر نوع کے کرپشن کے اڈے بن چکے ہیں۔ اساتذہ جو بھی اصلاح معاشرہ کی تربیت دیا کرتے تھے۔ آج ان دانش گاہوں میں لاکھوں روپے کے لین دین سے ریسرچ اسکالروں کے مستقبل سے کھلواڑ کیا جا رہا ہے۔ ماہرین اور ایکسپرٹ

کے نام پر بدعنوانیوں میں ملوث لوگ انٹرویو بورڈ میں جمع ہوتے ہیں اور نا اہل امیدواروں کو رشوت کھا کر منتخب کر لیا کرتے ہیں۔ یہ کرپشن کا ایسا غیر مختتم دائرہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک نا اہل پروفیسر اپنی ملازمت کے دوران سینکڑوں نا اہل افراد کو دانش گاہوں میں درس و تدریس جیسے مقدس پیشے کو تباہ کرنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے اس افسانے میں جگ بیتی بیان کی ہے۔ لیکن اس حمام میں سبھی ننگے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ براہ راست یا بالواسطہ طریقے سے ہم سبھی اس بدعنوانی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اگر اس نوع کے کرپشن کا بروقت انسداد نہیں کیا گیا تو یہ وبا ہماری دہلیز تک چلی آئے گی۔ رشوت خوری کی آگ سے پھر کوئی بھی اپنا دامن نہیں بچا پائے گا۔

یونیورسٹیوں میں پھیلنے والی گرافنگ کی وبا پر اتنی بیباکی سے اب تک کسی نے نہیں لکھا ہے۔ مشتاق احمد وانی کو ان کی اس فنکارانہ جرأت پر دل کھول کے داد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ گناہگاروں پر یہ افسانہ پہلا پتھر ثابت ہوگا اور وہ دن دور نہیں جب انھیں سرعام سنگسار کیا جائے گا۔ ادب کا ایک منصب یہ بھی ہے کہ فن پاروں کے ذریعے گرد و پیش کی آلودگیوں کو دور کیا جائے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مشتاق احمد وانی کا افسانہ ”اندر کی باتیں“ کرپشن کا پردہ فاش کرنے میں صد فی صد کامیاب نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس کے سبھی کردار اپنی حرکات و سکنات سے گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ مختلف سیاق و سباق کے حوالے سے ان کے عمل اور رد عمل بہت فطری انداز کے دیکھائے گئے ہیں۔

”پانچ سال کا بن باس“ اس مجموعے میں شامل سب سے طویل کہانی ہے۔ مشتاق احمد وانی نے اپنے تخیل کی پرواز سے اردو افسانے کو ایک ناقابل فراموش کردار سے روشناس کرایا ہے جس کا نام کبھی بھلایا نہیں جاسکتا ہے اور وہ کردار ہے ”زلفاں بی بی“۔

زلفاں بی بی ایک ہونہار لڑکی ہے۔ گرچہ اسے قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہر سے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں بکلی، پانی، سڑک اور ان پڑھ لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خوبصورت اور جوان ہونے کی وجہ سے بد معاشوں اور اوباشوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے وہ بہت ہی ہوشیاری

اور صبر و سکون سے کام لیتی ہے۔ کئی مواقعے ایسے آتے ہیں کہ جہاں دوسرا کوئی شخص ہوتا تو چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کر لیتا لیکن زلفاں بی بی بہت خدا ترس اور باہمت لڑکی تھی۔ اس کے قدم کہیں ذرا بھی نہیں ڈگمگاتے ہیں۔ وہ ہر دم اپنے ماں باپ کے بتائے ہوئے اصولوں پر سختی سے کار بند رہتی ہے اور کامیابی لگا تار اس کے قدم چومتی چلی جاتی ہے۔

گاؤں کے اسکول کی ترقی کے معاملے میں کوئی بھی دقیقہ اس سے فرو گذاشت نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی محنت اور لگن سے گاؤں کے سرچنچ، بچوں اور نمبرداروں کے ذریعے پر امری اسکول کو ترقی دلا کر ٹڈل اسکول میں بدل دیتی ہے۔

مشتاق احمد وانی نے زلفاں بی بی کے کردار کے ارتقا میں نامیاتی بالیدگی کو بہت اچھے سے ٹریٹ کیا ہے اور اس کی ذہنی پختگی اور بالیدگی کو بہت ہی غیر محسوس طریقے سے دیکھایا ہے کہ وہ اپنے والد امان اللہ کے مشورے پر کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان دیتی ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ زلفاں کے کردار میں اس طرح کی بتدریج تبدیلی مشتاق کی فنکارانہ چابکدستی کی غماز ہے۔ زلفاں کی کامیابی پر جیت رام نمبردار جو ایک نمبر کا بد معاش تھا وہ بھی ڈر کے مارے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اُس کے یہ جملے دیکھئے بی بی جس سے مشتاق وانی مر کالہ نگاری میں کتنا مشتاق ہیں، وہ بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

”میڈم بھگوان کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ تو دیوی کا روپ ہیں۔ میں مورکھ آپ کو پہلے پہچان نہیں پایا تھا۔ جیت رام نمبرداری کی آنکھیں احساسِ ندامت سے اشکبار تھیں۔“

افسانہ ”آنکھوں کی عصمت دری“ کے آئینے میں مشتاق احمد وانی پریم چند جیسے آدرش وادی فنکار معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اخلاقی تعلیم کو اپنے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ میگھ ناتھ کے معصوم ذہن پر ایک چھوٹی سی شرارت کی انتہائی سخت سزا نے انجام کار اسے ایک ایسا انسان بنا دیا کہ جسے لفظ ”پریم“ اور جنس مخالف کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بچپن کا اس زد و کوب نے میگھ ناتھ کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر مرتب کیا تھا کہ شادی کے بعد چار بچوں کے باپ بن جانے کے بعد بھی وہ کسی عورت کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے کا قائل نہ تھا۔ جبکہ اُس کی عمر اکاون سال کی ہو چکی تھی۔ کہا جاتا

ہے کہ انسان اپنے ماحول سے بھی اثرات قبول کرتا ہے۔ میگھ ناتھ کے گھر میں بھی نیم عریاں اور فحش پروگرام ٹیلی ویژن پر دیکھے جاتے تھے اور دفتر میں چاروں طرف اخبار اور موبائل فون کے علاوہ لیپ ٹاپ پر عریاں عورتوں کی فحش تصاویر دیکھی جاتی تھیں۔ میگھ ناتھ گاندھی میموریل پارک اور قومی وراثت ہاؤس کی سیر کو جاتا ہے، تو وہاں کے ماحول میں بھی کھلم کھلا جنسی آمیزش کے نظارے اس کا استقبال کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر وہ دل برداشتہ ہوا اٹھتا ہے۔ لیکن سینما ہال کے پردے پر عریانیات بھری جنسی اختلاط کے مناظر دیکھ کے وہ اپنی اخلاقی قدروں کو پامال ہونے سے بالکل بھی بچا نہیں پاتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ آج اُس نے اپنا سب سے قیمتی خزانہ کوڑی کے مول لٹا دیا ہے۔

بچپن کی تادیب اور تہذیب انسان کو زندگی بھر کجروی (Perversion) سے بچاتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ آدرش اور اعلیٰ اخلاق کا یہ آئینہ ہلکی سی جنبش سے ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاتا ہے تو ایسے انسان کا ضمیر اُسے کبھی معاف نہیں کر سکتا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے کمال درجہ سادگی اور فنکاری سے ایسے قول زریں کو ترسیل کی مزاحمت کے بغیر براہ راست ہم تک منتقل کر دیا ہے۔

”جسم خور کیرا“ میں مشتاق احمد وانی نے فلسفہ حیات کو افسانے کے توسط سے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ دو متوازی کہانیاں ہیں۔ ایک لالہ مدن گوپال اور کملاوتی کی جو گذر چکی ہے اور تنہیہ الغافلین کا نمونہ ہے اُن کے لیے جو دیدہ بینا رکھتے ہیں۔ دوسری کہانی غلام عباس اور نوری کی ہے جو زندگی کے وسطی پڑاؤ میں اربانوں اور خواہشوں کا گھروندا سجائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مدن گوپال کی تینوں زینہ اولاد و غادے جاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار وحشتِ حیات میں اپنی آخری منزل کی تلاش میں بھینک رہے ہیں۔ دوسری طرف نوری اپنے چاروں زینہ اولاد سے بڑی بڑی آس اور امیدیں لگائے پنوں میں جی رہی ہے۔

لیکن غلام عباس کو وہیل چیئر سے اپنی قبر کی تاریکی محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ اپنی بیوی نوری کو افسانے کے اختتام میں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ ”جسم خور کیرا“ کیا امیر کیا غریب کسی کو بھی نہیں بخشا۔ جب جسم کمزور پڑتا ہے انسان بوڑھا ہو جاتا

ہے تو اس کے عزیز و اقارب بھی اُس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے بے سہارا بوڑھے انسان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔

یہاں مشتاق احمد وانی کی شخصیت میں مضمحل تصوف کا رنگ ان کے افسانے سے جھلکتا ہے، اپنے اس پیغام کی ترسیل میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسے اچھے پیغام کے لیے میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

”فتنہ“ ایک ایسا افسانہ ہے جس میں باجماعت نماز پڑھاتے وقت پیش امام مولوی نعیم الدین کے موبائل فون پر گھنٹا فلمی گانے کے بول بج اُٹھتے ہیں اور اس سے مقتدیوں کی نماز میں خلل پڑ جاتا ہے اور اس سے مسجد کے اندر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ مقتدیوں کے دو گروپ بن جاتے ہیں جو آپس میں مارنے مرنے پر اُتر آتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے اس مختصر افسانے میں یہ بتایا ہے کہ اکثر ہمارے مذہبی رہنما مقتدیوں کے لیے کچھ اور اپنے لیے کچھ اور معیار قائم کر لیتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جس مسجد کے دروازے پر لکھا ہوتا ہے کہ ”مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل فون بند کر دیجیے۔“ اسی مسجد کے پیش امام صاحب سے یہ بھاری غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا موبائل فون آف کرنا بھول جاتے ہیں اور تین برسوں کی محنت سے بنی بنائی عزت پر آن کے آن میں پانی پھر جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مشتاق وانی کے اندر ایک حساس فکرموجود ہے۔ ایسا معمولی واقعہ جسے ہم آئے دن دیکھتے اور درگزر کرتے رہتے ہیں لیکن مشتاق نے اس کی گرفت کی ہے اور اس سے اُٹھنے والے فتنے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس معنی میں یہ افسانہ بہت کارگر معلوم ہوتا ہے۔

”باغی“ میں مشتاق احمد وانی نے بین مذہبی شادی اور رسم و رواج کی حمایت میں اپنی بات رکھی ہے۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑی چیز انسانیت ہے اور انسان کا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہونا چاہیے جو انسان کی ترقی میں مانع ثابت ہو۔ اس افسانے میں کسی پنڈت کا بیٹا جیون اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زندگی کو سائنسی نظریے سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اس وجہ سے اُسے کوئل جیسی درج فہرست ذات کی لڑکی سے شادی کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ سماج کو توڑنے میں سیاستدانوں کا

ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے مفاد کی حصولیابی کے لیے ہندو مسلم سکھ اور عیسائی میں جھگڑا کراتے رہتے ہیں۔ لہذا، وہ ساون کی اکیسویں تاریخ کو 'ملن میلہ' میں اپنے اس باغیانہ خیالات سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جواب میں اسے کسی احتجاج کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مشتاق اس افسانے کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی سچا مذہب یا رسم و رواج ارتقائے آدم کی راہ میں آڑے نہیں آتا۔ بلکہ سچا مذہب تو انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ یہی فطری رو یہ ہے اور یہی سائنسی نظریہ بھی ہونا چاہیے۔

”چھپا سانپ“ مشتاق احمد وانی کا زبردست افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک شہوت پرست پنڈت رتن شناستری کے سنگین جرم کا پردہ فاش کیا ہے جو جنسی ہوس کی آگ میں تپ کر اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اپنے ہی بیٹے کی بیوی میناکشی کے ساتھ زنا بالجبر کر بیٹھتا ہے اور جب بہو لوک لاج کے ڈر سے سرور بہو کے پاک رشتوں کو تار تار کر دینے والے سنگین جرم پر پردہ ڈال دیتی ہے تو ویدوں کا گیان رکھنے والے پنڈت کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا سانپ نما شیطان کھل کھیلنے کی ٹھان لیتا ہے۔ لیکن ایک مشہور کہاوت ہے کہ 'دناش کالین و پرت بدھی' یعنی جب کسی کی تباہی لکھی ہو تو اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ پنڈت رتن شناستری بھی اپنی مصیبت کو دعوت دے کر ایک بار پھر اپنی بہو کے ساتھ منہ کالا کر بیٹھتا ہے۔ پنڈت کی بہو میناکشی بہت سوجھ بوجھ والی سمجھدار اور پاک باز عورت تھی۔ اُس کی عمر مرنے کی نہیں تھی۔ وہ اپنی تین سالہ بچی کی پرورش و پرداخت بڑے لاڈ پیار سے کر رہی تھی۔ لیکن اس کے سر کی خباثت نے اپنی اوجھی حرکتوں سے ثابت کر دیا تھا کہ ایک عورت کی زندگی کا نج کے اُس گلدان کی طرح ہوتی ہے جو بلند یوں سے گرتے ہی پاش پاش ہو کر ایسی کرچیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ جسے سمیٹ کر دوبارہ کھڑا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہذا، میناکشی مہا پنڈت کے آڈمبر میں چھپے شیطانی سانپ کو سب کے سامنے ننگا کرنے کی ٹھان لیتی ہے اور خود سولی پر چڑھ جاتی ہے۔ خودکشی کے بعد میناکشی کے پاس سے جو خط نکلتا ہے وہ پنڈت رتن شناستری کے کالے لکڑیوں کا راز افشاں کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مشتاق نے کمال چابکدستی سے فن کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے اور ایسے زبردست موضوع کو افسانے کے سانچے میں ڈھالنے

ہے تو اس کے عزیز و اقارب بھی اُس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے بے سہارا بوڑھے انسان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔

یہاں مشتاق احمد دانی کی شخصیت میں مضمیر تصوف کا رنگ ان کے افسانے سے جھلکتا ہے، اپنے اس پیغام کی ترسیل میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسے اچھے پیغام کے لیے میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

”فتنہ“ ایک ایسا افسانہ ہے جس میں باجماعت نماز پڑھاتے وقت پیش امام مولوی نعیم الدین کے موبائل فون پر گھٹیا فلمی گانے کے بول بج اُٹھتے ہیں اور اس سے مقتدیوں کی نماز میں خلل پڑ جاتا ہے اور اس سے مسجد کے اندر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ مقتدیوں کے دو گروپ بن جاتے ہیں جو آپس میں مارنے مرنے پر اُتر آتے ہیں۔

مشتاق احمد دانی نے اپنے اس مختصر افسانے میں یہ بتایا ہے کہ اکثر ہمارے مذہبی رہنما مقتدیوں کے لیے کچھ اور اپنے لیے کچھ اور معیار قائم کر لیتے ہیں۔ الیہ یہ ہے کہ جس مسجد کے دروازے پر لکھا ہوتا ہے کہ ”مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل فون بند کر دیجیے۔“ اسی مسجد کے پیش امام صاحب سے یہ بھاری غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا موبائل فون آف کرنا بھول جاتے ہیں اور تین برسوں کی محنت سے بنی بنائی عزت پر آن کے ان میں پانی پھر جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مشتاق دانی کے اندر ایک حساس فنکار موجود ہے۔ ایسا معمولی واقعہ جسے ہم آئے دن دیکھتے اور درگزر کرتے رہتے ہیں لیکن مشتاق نے اس کی گرفت کی ہے اور اس سے اُٹھنے والے فتنے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس معنی میں یہ افسانہ بہت کارگر معلوم ہوتا ہے۔

”باغی“ میں مشتاق احمد دانی نے بین مذہبی شادی اور رسم و رواج کی حمایت میں اپنی بات رکھی ہے۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑی چیز انسانیت ہے اور انسان کا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہونا چاہیے جو انسان کی ترقی میں مانع ثابت ہو۔ اس افسانے میں کسی پنڈت کا بیٹا جیون اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زندگی کو سائنسی نظریے سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اس وجہ سے اُسے کو مل جیسی درج فہرست ذات کی لڑکی سے شادی کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ سماج کو توڑنے میں سیاستدانوں کا

ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے مفاد کی حصول یابی کے لیے ہندو مسلم سیکھ اور عیسائی میں جھگڑا کراتے رہتے ہیں۔ لہذا، وہ سادہ کی ایکسویس تاریخ کو ملن میل میں اپنے اس باغیانہ خیالات سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جواب میں اسے کسی احتجاج کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مشتاق اس افسانے کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی سچا مذہب یا رسم و رواج ارتقائے آدم کی راہ میں آڑے نہیں آتا۔ بلکہ سچا مذہب تو انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ یہی فطری رویہ ہے اور یہی سائنسی نظریہ بھی ہونا چاہیے۔

”چھپا سانپ“ مشتاق احمد دانی کا زبردست افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک شہوت پرست پنڈت رتن شاستری کے سنگین جرم کا پردہ فاش کیا ہے جو جنسی ہوس کی آگ میں تپ کر اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اپنے ہی بیٹے کی بیوی میناکشی کے ساتھ زنا بالجبر کر بیٹھتا ہے اور جب بہو لوک لالچ کے ڈر سے سرور بہو کے پاک رشتوں کو تار تار کر دینے والے سنگین جرم پر پردہ ڈال دیتی ہے تو ویدوں کا گیان رکھنے والے پنڈت کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا سانپ نما شیطان کھل کھیلنے کی ٹھان لیتا ہے۔ لیکن ایک مشہور کہات ہے کہ وناش کالین و پرت بدھی، یعنی جب کسی کی تباہی لکھی ہو تو اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ پنڈت رتن شاستری بھی اپنی مصیبت کو دعوت دے کر ایک بار پھر اپنی بہو کے ساتھ منہ کالا کر بیٹھتا ہے۔ پنڈت کی بہو میناکشی بہت سوجھ بوجھ والی سمجھدار اور پاک باز عورت تھی۔ اُس کی عمر مرنے کی نہیں تھی۔ وہ اپنی تین سالہ بچی کی پرورش و پرداخت بڑے لاڈ پیار سے کر رہی تھی۔ لیکن اس کے سر کی خباثت نے اپنی اوجھی حرکتوں سے ثابت کر دیا تھا کہ ایک عورت کی زندگی کانچ کے اُس گلدان کی طرح ہوتی ہے جو بلند یوں سے گرتے ہی پاش پاش ہو کر ایسی کرچیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ جسے سمیٹ کر دوبارہ کھڑا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہذا، میناکشی مہا پنڈت کے آڈمبر میں چھپے شیطانی سانپ کو سب کے سامنے ننگا کرنے کی ٹھان لیتی ہے اور خود سولی پر چڑھ جاتی ہے۔ خودکشی کے بعد میناکشی کے پاس سے جو خط نکلتا ہے وہ پنڈت رتن شاستری کے کالے کرتوتوں کا راز افشاں کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مشتاق نے کمال چابکدستی سے فن کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے اور ایسے زبردست موضوع کو افسانے کے سانچے میں ڈھالنے

میں وہ بڑے کامیاب رہے ہیں۔ بیانیہ بہت ہی واضح ہے۔ صاف اور شفاف نثر میں قصے کو بتدریج نقطہ عروج تک بڑی فنکارانہ دیانتداری کے ساتھ پہنچایا ہے۔ اس طرح، انھوں نے اردو ادب کو ایک کریمہ شیطانی کردار سے رو برو کر لیا ہے۔

مشتاق وانی کا 'سوچھا بھیاں' پر طنز کرتا ہوا ایک افسانہ ہے، "باہر اور اندر کا منظر" جس میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اکثر باہر اور اندر کا منظر ایک جیسا نہیں ہوتا ہے۔ سیوانا تھ جیسے مشہور و معروف مٹھائی والے جس کی دکان کا نام ہے۔ "دین دھرم سویت شاپ" اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اصلی گھی میں اپنی مٹھائیاں تیار کرواتا ہے۔ لیکن ایک دن غلطی سے اس کی دکان کا اندرونی دروازہ کھلا رہ جاتا ہے اور دو گاہک احسان الحق اور اس کا عزیز دوست رادھے شیم دونوں کی آنکھوں کے آگے اُس دکان کی سچائی عیاں ہو جاتی ہے۔ سیوانا تھ اپنی شہرت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا اور وہ بہت ہی گھسیار و غن سے مٹھائیاں تیار کرواتا تھا۔ اس سے بھی گری ہوئی بات یہ تھی کہ اس کے یہاں صفائی کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ دونوں گاہک یہ منظر دیکھ کر دل برداشتہ ہو کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانہ "باہر اور اندر کا منظر" میں بڑے ہی فنکارانہ ڈھنگ سے اونچی دکان پھیکا پکوان والا محاورہ بچ کر دکھایا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا کرپشن ہی ہے جس کے خلاف آواز بلند کرنا کسی بھی قلم کار کی سماجی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری مشتاق احمد وانی نے اس افسانے کے حوالے سے بڑی ایمانداری سے نبھائی ہے۔

اسی طرح ان کا ایک افسانہ ہے، "چہرہ چھپائے لوگ" جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گھر سے قدم نکالتے ہی گھر کی اخلاقی تعلیم اور آداب معاشرت کو طاق پر رکھ کر اخلاق سوز اور بے غیرتی کے ماحول میں رنگ جاتے ہیں۔ اس افسانے میں چند بالغ اور جوان لڑکیاں اپنے گھر سے کالج جانے کے بہانے سڑک چھاپ عاشقوں کے ساتھ شہر کی آبادی سے دور گھنے جنگل کے اندھیرے میں روپوش ہو کر جنس مخالف کی قربتوں کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس کام کا انھیں چسکا لگ جاتا ہے۔ لیکن انھیں سماج کا ڈر بھی ستاتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ راستے میں موٹر سائیکلوں پر سے گذرتے ہوئے وہ لڑکیاں چہرہ چھپائے پھرتی ہیں تاکہ ان کے بزرگ اور

اقارب دیکھ کر انھیں پہچان نہ لیں، اور ان کے ڈھول کا پول نہ کھل جائے۔ ایسی مینی نظر مشتاق وانی ہی کی ہو سکتی ہے۔ یہ بظاہر معمولی سا نظر آنے والا واقعہ دراصل پورے معاشرے کو بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کی دلدل میں ڈھکیل رہا ہے۔ وقت رہتے اس کی سرزنش اور تذارک کی طرف مشتاق احمد وانی نے بڑی عقلمندی سے اشارہ کیا ہے۔

”سرگوشی“ کا عمل شیطان کا کام ہے۔ خوشحال اور گوپال دو ایسے ہی مفسد نو جوان ہیں جو دو محبت کرنے والے جوڑے کو اپنی سرگوشی سے وسوسے میں ڈال دیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں عاشق و معشوق کے مابین باتوں کی ٹکراؤ شروع ہو جاتی ہے اور محبت کو نفرت میں بدل لیتے کچھ دیر نہیں لگتی ہے۔ اس بات کی مشتاق وانی نے اپنے افسانہ ”سرگوشی“ میں بڑی مؤثر ڈھنگ سے منظر کشی کی ہے۔

اسی طرح، ”بابا کو کچھ ہو گیا“ اور ”ایک اہم سوال“ مشتاق کے ہلکے پھلکے موڈ کے مختصر افسانے ہیں جو ذائقہ بدلنے کے لیے چند منٹوں میں پڑھ کر محفوظ ہونے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے مقصدی اور اصلاحی افسانوں کے ذریعے معاشرتی اور تہذیبی بحران کا اخلاقی اور مذہبی نظریے سے سدباب کرنے اور اس کے تذارک کی کوششیں کی ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی اخلاقی ناہمواری دیکھتے ہیں تو ان کا قلم فوراً چل پڑتا ہے اور پھر سماج کے ایسے افراد کی تادیب و تہذیب کے لیے وہ ان کی سرعام سرزنش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ اصلاح معاشرہ کی خاطر ان کی بڑی سختی سے گرفت بھی کرتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے افسانے تکنیکی اعتبار سے تمہیدی کلمات اور کرداروں کے تعارف سے شروع ہوتے ہیں اور ایک سیدھے راستے پر چلتے ہوئے اپنے نقطہ منتہا پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں استعجاب اور تحیر جیسے عناصر زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ اپنی بات بہت ہی سادگی، دلچسپی اور خوبصورتی کے ساتھ قارئین کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر افسانوں میں کردار بہت جاندار اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کرداروں کا تعلق وادی کشمیر سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری میں وہ بہت انتہاک سے کام لیتے ہیں۔ جس سے کردار کو

اس کے ماحول سے جوڑ کے دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مشتاق احمد وانی کے اسلوب اور زبان و بیان سے کشمیریت بخوبی مترشح ہوتی ہے۔ مکالمات کی ادائیگی سے کرداروں کی سماجی حیثیت (Status) کا بھی پتہ لگتا جاتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کا سماجی اور سیاسی شعور بہت بالیدہ ہے۔ زندگی سے متعلق ان کے تلخ و شیریں تجربات بھی کافی گہرے ہیں۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور افسانہ نگار جو اپنی انفرادی بصیرت بھی رکھتا ہو، ہمیں توقع ہے کہ مستقبل میں وادی کشمیر کا روشن ستارہ بن کر اردو افسانے کو بلند یوں تک پہنچانے میں اہم رول ادا کرے گا۔



ڈاکٹر الطاف انجم

(اسٹنٹ پروفیسر اردو، فاضلاتی نظام تعلیم کشمیر یونیورسٹی)

09419763548

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا جہانِ افسانہ

دنیاے اردو میں کچھ لوگ ایسے بھی واقع ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے مشاہدے کی گہرائی، فکری بساط اور فنی درو بست کے امتزاج سے بہت جلد اپنے قارئین کو مناسب حد تک متاثر کر دیا، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تعلق بھی تخلیق کاروں کی اسی فیل سے ہے۔ انہوں نے اگرچہ نہایت ہی کم سنی میں داخلی سطح کے میلانات و رجحانات کو صغیر قمر طاس پر بکھیرنے کا فن سیکھا تھا لیکن اُن کی آواز ذرا دیر بعد ادبی حلقوں میں سنی اور پہچانی گئی۔ موصوف بیک وقت افسانہ نگار، ناول شناس، محقق، تنقید نگار ہونے کے علاوہ ادبی صحافی بھی ہیں اور اردو کے موقر اور ممتاز رسائل و جرائد میں تو اتر کے ساتھ اپنی ہشت پہلو ادبی تخلیقات کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور بازوق قارئین سے داد و تحسین وصول کر رہے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعہ جات تا حال منصہ شہود پر آچکے ہیں جنہوں نے افسانہ پسند قارئین سے خاطر خواہ انداز و اسلوب میں پذیرائی حاصل کی ہے۔ زیر ترتیب مجموعہ ”اندر کی باتیں“ ڈاکٹر وانی کی تیسری افسانوی سوغات ہے جو سابقہ دو مجموعہ جات کے مقابلے میں اس اعتبار سے اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس میں افسانہ نگار فکری تنوع مندی، جمالیاتی حسیت، لسانی اہلیت (Linguistic Competence) اور معاشرتی شعور کی پختگی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

”اندر کی باتیں“ بارہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں افسانہ نگار نے ذاتی

تجربات و مشاہدات اور تصورات و مفروضات کو تخلیقی کیمنوس پر اتارنے کی کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک قاری کو محبت کے جلتے بجھتے جذبات کی کہکشاں بھی نظر آتی ہے اور سماجی نابرابری کی غیر مختتم کڑیاں بھی، ازدواجی زندگی کی حقیقی اور رومانی صورت حال بھی ہے اور اس دنیا کے فانی تصورات کی ختم ریزی بھی۔ ”جسم خور کیڑا“ میں انہوں نے تصورِ وقت کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ انسانی رنگ میں رنگ دیا ہے اس کے لیے افسانہ نگار کی فکری پختگی کا دل سے قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس میں میاں بیوی غلام عباس اور نوری کے کرداروں کے ذریعے وقت کے مضبوط بہاؤ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

”غلام عباس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے، ”نوری! مجھے وقت کے گزرنے کا احساس اندر ہی اندر نوچتا اور جھنجھوڑتا ہے کبھی کبھی یہ تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش! وقت کی رفتار تھم جائے اور تغیر نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے۔ میں جوان رہوں اور تم بھی جوان رہو! ہم دونوں حسن و عشق کی ڈور میں یوں بندھے رہیں کہ یہ ڈور کبھی ٹوٹنے نہ پائے! مگر یہ سب کچھ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وقت کے آگے بے بس و مجبور ہیں! کیوں کہ وقت جیسے دیو ہیکل کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹک سکا ہے۔ اس نے آج تک سب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ یہ بڑی بے دردی سے سب کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے کسی کی پروا نہیں۔“

یہ اقتباس دراصل افسانہ نگار کے تصورِ زمان کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دورِ حاضر کا ایک عام انسان بھی اپنا عکس احسن طریقے سے دیکھ سکتا ہے۔ وقت کی تند اور تیز لہروں کی رفتار ہر زمانے میں گزشتہ کے مقابلے میں تیز ہی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس افسانہ کے اولین قاری کی حیثیت سے میں ذاتی طور پر افسانہ نگار کے ساتھ خیالات کی سطح پر ہم آہنگی محسوس کرتا ہوں۔ اسی طرح ”ایک اہم سوال“ میں لوٹ کھسوٹ اور دنیوی ظاہر داری پر مبنی کچھ واقعات کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ہمیں یہ اپنی ہمسائیگی کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بدرالدین کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ

حرام مال و دولت سے تجوریاں بھر کر ایک انسان متاع دنیا میں کس قدر اندھے پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ حرام کمائی سے بھری ہوئی تجوریاں لٹنے کے باوجود بھی بدرالذین ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ جب اس کے گھر پر لوگوں کا جم غفیر جمع ہوتا ہے تو وہاں پر موجود ایک عالم اور صالح نوجوان خواتین و حضرات سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”خواتین و حضرات! آپ میں سے تقریباً بہت سے افراد کا یہی کہنا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دن رات جو کروڑوں ٹن شراب پی جاتی ہے، لاکھوں زنا کے اڈے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ رشوت، ظلم و استحصا، چیزوں میں ملاوٹ، ہیرا پھیری، دھوکہ و فریب، حق تلفی، ڈاکہ زنی، غنڈہ گردی، شکم مادر میں بیٹیوں کا قتل، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے چشم پوشی غرضیکہ یہ سب کچھ کیا خدا کر داتا ہے؟ میں آپ سے اس اہم سوال کا جواب چاہتا ہوں۔“

لیکن اس سب کے باوجود بدرالذین تھانے میں رپورٹ لکھوانے پر بضد ہے۔ بنیادی طور پر افسانہ نگار اپنے قارئین کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادراک و عرفان سے واقف کرانا چاہتا ہے اور اس دوران وہ مادی کشمکش اور مسابقتی اندازِ زیست کی مثالیں فراہم کرتے ہیں جن سے دورِ حاضر کا ہر شخص کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوا ہے۔ ”باغی“ نام کا افسانہ سماجی بندھنوں کو توڑتا ہوا ایک غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے سماجی اور معاشرتی شعور کو بروئے کار لا کر اس کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ کوئل اور جیون داس کے آپسی تال میل کے ذریعے افسانہ نگار نے اُن مسائل و مصائب کا اظہار کیا ہے جن کا سامنا ہر اُس شخص کو یہاں پر ہوتا ہے جو ذاتِ پات، رنگ و نسل، دھن و دولت کے قائم کردہ خطوط کو ذرا سا بھی پار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئل کا جرم صرف اتنا ہوتا ہے کہ اُس کو قدرت نے ایک رام داسی گھر میں پیدا کیا تھا جسے برہمن پست ذات گردانتے ہیں۔ ان واقعات سے افسانہ نگار کے قلب و ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اس لیے وہ یہاں پر اپنے داخلی درد و کرب کو مختلف کرداروں کے ذریعے ظاہر کرنے کی کامیاب کوشش کرتے

ہیں۔ ویسے بھی ذات پات پر مبنی سماجی ڈھانچہ (Social Structure) حساس اور دانشمند حضرات کے نزدیک طبقاتی تقسیم کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے جسے کسی بھی طرح لاپرواہی سے نہیں سمجھا جاسکتا ہے اور اس کو یہاں پر افسانہ نگار نے بھی معطون کیا ہے، جس کا عندیہ ان کے اس اقتباس سے ملتا ہے:

”جب وہ سماج میں ذات پات میں بٹے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم اور تضادم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلکتا ہو جاتا اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضاءِ بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک ایک منہ ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں بالکل سرخ رنگ کا، تو پھر یہ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی، بدھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا یہ انسان آخر کیوں؟“

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک آتے آتے اطلاعاتی ٹکنالوجی کی ہوش ربا ترقی نے زندگی کی جملہ قدروں کو یکسر بدل دیا لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے سماج میں رنگ و نسل کی سیاست اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ افسانہ کا پلاٹ انسانی کدورتوں کو دھو دینے کا کام کر سکتا ہے بشرطیکہ انسان ہر صورت میں اپنی آنکھوں کو کھلا رکھے۔ بقول غالب۔

بخشے ہے جلوہ گلِ ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے زیر ترتیب افسانوں میں اپنی لسانی مہارتوں کا خوب صورت طریقے سے استعمال کیا ہے۔ زبان کو تخلیقی سطح پر برتنے کا معاملہ کلی طور پر فن کار کے انفرادی مشق و مہارت اور اکتسابِ فیض پر منحصر ہے۔ موصوف اس وجہ سے مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ممکنہ طور پر زبان کو تخلیقی انداز میں برتنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری کا بھی کہیں کہیں پر مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

”اس کی بیوی میناکشی انتہائی حسین تھی۔ بونا قد، لمبیری گھنیری سیاہ زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں، دسکتے بھرے بھرے رخسار، موتیوں کی لڑی ایسے دانت، گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹ، ستواں ناک، صراحی دار گردن، مخروطی انگلیاں، جھلمل کرتی ہوئی چوڑیاں، اس کا تھل تھل کرتا وجود نہایت دلکش تھا۔“

اسی طرح انہوں نے ”باہر اور اندر کا منظر“ کی تمہید باندھتے ہوئے قدرت کے مناظر کی عکاسی جس خوب صورت انداز میں کی ہے وہ پڑھنے اور پڑھنے کے بعد داد دینے سے تعلق رکھتا ہے:

”یہ دکان ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو قدرتی ماحول و مناظر سے آراستہ و پیراستہ ہے..... دیودار کے سدا بہار جنگلوں کا ایک لاتناہی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، طرح طرح کے پرندوں کی بولیاں اُن کی روح پرور چچہاہٹ اور پھر خاص کر موسم بہار میں چاروں جانبہریالی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، سوہن، چمپا، جُوبھی، کیوڑا، گلاب اور مولسری جیسے پھولوں کی رنگت اور خوشبو سیاحوں کے دماغوں کو معطر اور رحوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔“

اس مجموعہ میں ایک افسانہ ”اندر کی باتیں“ سوانحی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس میں یونیورسٹی میں خیالورام کے تقرر کے لیے غیر اخلاقی، غیر علمی اور غیر قانونی حربے اختیار کیے جانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ویسے دورِ حاضر کے دانش کدوں میں علم و عرفان کی بجائے جہالت و گمراہی کے عناصر ہی پروان چڑھتے نظر آتے ہیں اور آئے دن اخباروں کے کالموں اور ٹیلی ویژن چینلوں پر ایسی خبریں گشت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ڈاکٹر مشتاق کی محنت شاقہ، علمی صلاحیت اور تخلیقی جوڈت کے استخراج سے جس فکری جوہر کی ترتیب و تہذیب ہوئی ہے، اُس کی خاطر خواہ انداز میں قدر دانی کا حق ادا تا حال نہیں کیا گیا اور بیشتر موقعوں پر خیالورام جیسے نا اہل اور بے علم شخص کو موصوف پر اس لیے ترجیح دی گئی کہ وہ ارباب اقتدار خود ان کی علم و ادب شناسی کے سامنے اپنا چراغ نہیں جلا

سکتے تھے، اس لیے ان کو ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ زیر نظر افسانے میں انہوں نے نریش رانا، کل کانت، چترنجن باسو، خیالورام، منوج اگر وال، کل دیپ سنگھ، کندن لال جیسے کرداروں کے ذریعہ سے جامعات میں تقرری کے حالات و واقعات بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نوعیت کے افسانے کو موثر اور کامیاب بنانے میں جہاں وسیع مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے وہیں ذاتی تجربہ بھی اس کو کندن بنادیتا ہے۔ ویسے بھی تخلیقی فن پارہ ثقافتی کوڈز اور کنونشنز کا مظہر ہوتے ہوئے بھی فن کار کے نفسیاتی رموز و کوائف کا آئینہ ہوتا ہے۔ اب فن کار کا ہر فن پارہ کلی طور پر نہ سہی لیکن جزوی طور پر وہ اپنے خالق کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ ”اندر کی باتیں“ میں ڈاکٹر مشتاق نے کل کانت کی زبان سے جس داخلی درد و کرب اور انتشار و اضطراب کا اظہار کیا وہ آج کل کے کچھ بیہودہ اشخاص کی گھناونی حرکتوں پر دال ہے۔ شعبہ تاریخ کے سربراہ چترنجن باسو کے بارے میں ہوٹل مالک نریش رانا جب یہ کہتا ہے کہ:

”مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ممتحن بن کے کہیں جاتا ہے تو کال گرل بلک کرواتا ہے اور ایسی مدرا کی خواہش میں رہتا ہے جس کے پیٹنے سے آدمی کی آنکھیں دن کو بھی تارے گننے لگتی ہیں اور وجود میں پر ڈھیر ہونے لگتا ہے“

توقاری اس قدر مبہوت ہوتا ہے کہ بار بار ایسے کردار کو ملعون و معطون ٹھہراتا ہے۔ اسی طرح جب چترنجن باسو اپنے چیلے خیالورام کی سفارش مختسین سے کرتا ہے تو دارالعلوم کے ارباب اختیار اور قواعد و ضوابط سے عام انسان کا ایمان اٹھ جاتا ہے:

”میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ یہ نوجوان اسے سر سے پیر تک دیکھ لیجئے اس کا نام خیالورام ہے۔ اس کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ یہ ہسٹری میں ایم۔ فل، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہے نہایت شریف دیانت دار اور محنتی ہے۔ اس لیے آپ نے اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھا ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ

اور پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔ بڑی مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس پہنچا ہوں میری آپ سے یہ بھی گزارش ہے کہ مکمل کانت نام کا ایک اور امیدوار کافی پھرتیاں مارتا ہے۔ اُس کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ میری تمام پلاننگ خاک میں مل جائے گی۔“

ڈاکٹر وانی کے افسانوی کینوس پر جو عناصر ظاہر ہوئے ہیں وہ اپنی گونا گوں کیفیات کی وجہ سے حد درجہ قابل توجہ ہیں۔ انہوں نے اس اقتباس میں بعض جامعات میں ہو رہی دھاندلیوں کا جو پردہ فاش کیا ہے وہ سماج کے سربراہان اور شاخص کو ہوش کے ناخن لینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح کے حالات و واقعات ہر کسی تعلیمی ادارے میں واقع نہیں ہوتے ہیں لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ہر جگہ دودھ کے دھلے ہوئے لوگ بیٹھے ہیں۔ چترنجن باسو جیسے افراد نہ صرف تعلیمی دان لگا ہوں کا معیار ملایا میٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں بلکہ وہ زندگی کے دوسرے شعبہ جات میں بھی رخنہ انداز ہوتے رہتے ہیں۔

آج کا احساس تخلیق کار دراصل معاشرے کی ایک بیش بہا نعمت ہے جو افلاطون کے نظریات کے برعکس سماجی اقدار اور مثبت رویوں کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر وانی کی زیر بحث کہانیوں کے اکہرے اور عمیق مطالعہ سے قاری کو پہلی ہی نظر میں ان کی اخلاقیات سازی کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے۔ زیر ترتیب کہانیوں کا خیر ہی معیاری اقدار حیات سے تیار ہوا ہے جس کا اندازہ قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ان کی یہ ساری کہانیاں شر پر خیر کی فتح کا عندیہ دیتی ہیں۔ ”اندرو کی باتیں“ میں چترنجن باسو اخلاق سوز حرکات اور غیر علمی و غیر قانونی کارروائیوں کی وجہ سے عمر کے اُس حصے میں بے دست و پا ہو گیا جس میں مستعد ہوش و حواس اور تاب و توان ہر انسان کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار نے مظلوم و محکوم مکمل کانت کی آہوں و سسکیوں کے اثر سے ظالم و زانی چترنجن باسو کا انجام اس طرح رقم کیا ہے:

”بالآخر اُس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو بھگوان کے دربار میں شرف

قبولیت حاصل ہو گیا، ادھر کل کانت کا جاپ پورا ہوا، ادھر چترنجن باسو کے ہاتھوں اور پیروں میں بے جسی پیدا ہو گئی اور پھر جب وہ شہر کے مشہور ماہر امراض ڈاکٹر یوگیشور کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اُسے بڑے دکھی لہجے میں کہا:

”باسو صاحب! آپ کے جسم میں کوڑھ کی بیماری نے ڈیرہ ڈال دیا ہے!“

تخلیقی فن اپنی اصل میں ایک جمالیاتی سرگرمی ہے جو فن کار کے خارجی تجربات و مشاہدات اور داخلی احساسات و مفروضات کا ایک ایسا خوب صورت امتزاج ہوتا ہے کہ ہر باذوق انسان اس فن پر داد و تحسین ادا کرنے کے بعد فن کار کے داخل میں رونما ہونے والی مختلف کیفیات کو محسوس کرنا چاہتا ہے جس میں وہ اکثر و بیشتر ٹھوکریں کھاتا ہے کیوں کہ انسان کا داخل ایک ایسی دنیا ہے جس کا کولبس ابھی تک پیدا نہیں ہوا، مگر اس فن کار کا متن ثقافتی تشکیل ہونے کے باعث معاشرے کے اجتماعی لاشعور میں پیوست حسن کی جملہ کیفیات کا مظہر ہوتا ہے اور اس طرح قاری فن پارہ میں نہاں اور عیاں جمالیاتی محاسن کی تہوں اور طرفوں تک رسائی حاصل کر کے اپنے ذوق کی تسکین و تکمیل کر سکتا ہے۔ زیر ترتیب مجموعہ میں ڈاکٹر وانی نے حسن کی رعنائیوں کا ذکر بھی خوب کیا ہے گرچہ وہ افسانوں کا مجموعی یا بنیادی موضوع نہیں ہے لیکن وہ اپنی جمالیاتی حس کا شعوری یا غیر شعوری اظہار کرنے سے باز نہیں رہتے۔ چوں کہ عورت حسن و جمال کا منبع ہے اس لیے وہ اسی کا ذکر کر کے اپنی نازک حسیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانہ ”آنکھوں کی عصمت دری“ میں حسن کی کرشمہ سازی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

”جب وہ صبح اپنے دفتر کی طرف نکلتے تو راستے میں ایک کہہارن اپنی دکان پر سچی سنوری بیٹھی دکھائی دیتی جس کے بال بکھرے ہوئے، کندھوں تک موٹی تنگی باہیں اور قمیض کا گلا اتنا نشیبی کہ اُس کی معمولی جنبش سے قدرت کا انمول خزانہ ہمک ہمک کے باہر آنے کو ترستا۔“

معاشرے کے مختلف مسائل و مصائب اور رجحانات و میلانات کو تخلیقی سطح پر برتنے کا ہنرمشاں کو خوب آتا ہے کیوں کہ ان کے یہاں زبان پر مناسب دست رس ہونے کا احساس ملتا ہے۔ موصوف چوں کہ ہندی اکثریت والے علاقے میں اپنی صبح کو شام

کرتے ہیں اس لیے ان کی تخلیقی زبان میں ہندی الفاظ کا استعمال کوئی غیر فطری بات نہیں ہے بلکہ یہ اپنی زمین اور اس میں پیوست جزوں کے ساتھ مناسبت کی ایک عمدہ مثال ہے جسے ساختیات (Structuralism) کے حوالے سے ثقافتی کنونشنز سے وابستگی کا ایک مظہر تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں موقع محل کی مناسبت سے زیر ترتیب افسانوی مجموعہ میں ہندی کے کچھ الفاظ کے استعمال پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا بیجا نہ ہوگا:

- ☆ تو نے پورے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ میرا دھرم بھر شٹ کرے گا۔
- ☆ من بھاری ہونے لگتا ہے اک اگنی سی ہر وقت شریر میں جلتی رہتی ہے۔
- ☆ دکھیاری مینا کشتی شرما آج سنسار والوں سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو رہی ہے۔
- ☆ دونوں کے دلوں میں نہ جانے کب سے ایک دوسرے کے تئیں پریم رس کی دھار نے پچھل سی مچادی تھی۔

- ☆ پڑوس کے پنڈتوں کا چھورا میری کاپی پر پیار کا شبد لکھے ہے۔
- ☆ اُس رنڈوے کے ہاتھوں میں کیسے تیری کاپی پہنچی۔
- ☆ اپنی دھرم پتی سے بھوگ ولاس کرنا پاپ نہیں ہوتا ہے۔
- ☆ وہ بچوں کو ڈانتے اور انھیں آستھا، سنسکار اور ست سنگ جیسے دھارمک چینیل دیکھنے پر مجبور کرتے۔

- ☆ کسی کٹھنائی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟
- ☆ باسو صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کیسی چٹنا! بس سب کشل منگل ہے۔
- ☆ بقیہ امیدوار اس کے ارد گرد ایسے جمع ہو جاتے کہ جیسے وہ چار دھام کر کے آیا ہو۔
- ☆ اس نوعیت کی وافر مثالیں زیر ترتیب مجموعہ میں دیکھی جاسکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے متذکرہ بالا مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر افسانہ نگار کے ذخیرۂ الفاظ کو ذہن میں رکھیں تو انھیں اپنے معاصرین میں نمایاں مقام تفویض کیا جانا لازمی ہے جس کی وجہ سے ان کی افسانہ نگاری کی طرف خاطر خواہ توجہ کی جائے گی اور کہنی اور تہیں اور طرفیں منکشف ہو سکتی ہیں۔
- ☆ ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے میں ذاتی طور پر اس

بات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس میدان میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں ان کے دوسرے نمائندہ کارناموں پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ ”اُردو ادب میں تانیثیت“ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے ادبی حلقوں میں مناسب حد تک پذیرائی حاصل کی ہے۔ میں مصممِ قلب سے ڈاکٹر وانی کو زیرِ ترتیب افسانوی مجموعہ کی اشاعت کے لیے تہنیت پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ان کے دوسرے ادبی کارناموں کی طرح اس مجموعہ کی بھی بازوق ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔



ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

(پنڈہ یونیورسٹی، پنڈہ)

08863968168

مشاق احمد وانی کی افسانہ نگاری

ریاست جموں کشمیر کے ادبی منظر نامے پر ابھرنے والی جن آوازوں نے اردو قارئین کو فوراً اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں مشاق احمد وانی کا نام اہم ہے۔ ان کے افسانے، مضامین اور تحقیقی سرگرمیاں تازہ کاری کے ساتھ محنت، ایمانداری اور اعتماد کی قوتوں سے مزین ہیں۔

مشاق احمد وانی صاحب کو افسانہ نگاری اور افسانوں کی تفہیم و تنقید سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے ”تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران“ کے موضوع پر ایک کامیاب تحقیقی مقالہ (برائے پی ایچ ڈی) تحریر کیا، جو کلشن کی تنقید و تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مجموعہ ”مضامین“ ”آئینہ در آئینہ“، ”اعتبار و معیار“ اور ”شعور بصیرت“ میں کئی تحریریں ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو کلشن کی تخلیق و تنقید سے خاص رغبت ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے وہ خود افسانے لکھ رہے ہیں جو ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہونے کے علاوہ دو افسانوی مجموعوں کی شکل میں بھی منظر عام پر آ کر قارئین سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوی موضوعات کی وسعت، اسلوب کی تازہ کاری اور مشاہدے کی گہرائی معاصر افسانہ میں انہیں ایک الگ مقام عطا کرتی ہے۔

مشاق وانی کے افسانے سب سے پہلے اپنے وسیع کینوس کی وجہ سے ہمیں متاثر

کرتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موضوعاتی طور پر ہمیں پرانی قدروں کے ساتھ ساتھ نئی دنیا اور نئے آفاق سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ ہم دھماکے، کشمیر کا مسئلہ، بڑھتی ہوئی آبادی، فرقہ واریت کے معاملات، مذہب اور علاقائیت کے نام پر فسادات، ریب کے انسانیت سوز واقعات، رشوت کی گرم ستانی، سیاسی قدروں کی پامالی، تشدد اور جنسی تشدد کی بھیانک شکلیں، سیاسی بازیگروں کا لسانی تشدد کی بنا پر علاحدگی کی فضا قائم کرنا، ذات پات اور بھید بھاؤ کے نام پر عوام کو تقسیم کرنا، بے ہودہ رسوم و رواج، نوجوان نسل کا تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرنا، تعلیمی اداروں میں نظم و ضبط کی کمی، جنسی ہیجان انگیزی، فحاشی، بے حیائی اور حرام کاری کی طرف انسان کے بڑھتے قدم، نمود و نمائش اور حرام خوری ایسے موضوعات کو مشتاق وانی اپنی کہانیوں میں بڑی شدت اور حقیقت کے ساتھ برت رہے ہیں۔ دراصل مشتاق وانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کمال ہشیاری سے واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا منظر نامہ پرانی قدروں کے تحفظ کے ساتھ نئے فلسفوں اور نئے حقائق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ تلاش کہاں تک پہنچے گی، ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن سچائی کے ساتھ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کہانی سپاٹ بیانیہ کا شکار نہیں ہے۔ ایک طرف جدت اور حقیقت پسندی کے امتزاج سے نئے کولات تعمیر کر رہی ہے تو دوسری طرف تیزی سے بدلتی دنیا میں ان کی کہانیوں کا موضوع بن رہی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے شاید اسی لیے لکھا ہے کہ

”ان کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں بالخصوص اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت، انسانی رشتوں کا بکھرنا، بزرگوں اور ان کی اولادوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، خود غرضی لالچ اور کاروباری ذہنیت کا فروغ، نیز سماجی سطح پر لڑکیوں کی ناقدری اور ان کے جذبات کے تئیں عزیزوں، رشتہ داروں کی بے حسی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی سماج کے فاسد مادے کے معالج ہیں اور ان کی کہانیاں ترسیل، تاثیر اور دردمندی کے اعتبار سے توجہ چاہتی ہیں۔“

میٹھا زہر، ہزاروں غم، باغی، دوہری مار، فتنہ، اندر کی باتیں، پانچ سال کا بن باس اور اس طرح کی بہت ساری کہانیاں پڑھ کر آپ بہ آسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مشتاق احمد دانی کو موضوعاتی کہانیاں لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ اُن کے افسانوں میں تجربے، مشاہدے، حادثات اور واقعات کا بیان پورے کہانی پن کے ساتھ قائم رہتا ہے اور کہانی اپنے کرداروں کی زندگی کے اطراف گھومتی رہتی ہے۔ وہ اپنی موضوعاتی کہانیوں کے ذریعے آج کے سماج کو ایک سچا آئینہ دکھانا چاہتے ہیں جس میں جو بھی جھانکتا ہے اس کو اپنی اصل صورت نظر آتی ہے۔ ان کے کردار تخیل کی بھول بھلیوں سے جلوہ گر نہیں ہوتے بلکہ ہمارے آپ کے آس پاس ہی زندگی کے سکھ دکھ بھوگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کسی خاص رجحان یا ازم کے تابع نہیں ہیں۔ پیش کش کی سطح پر بھی ان کی افسانہ نگاری انتہائی سادہ اور سلیس ہے۔ سیدھی سادی زندگی کی کہانی، عام سے کردار، پلاٹ پیچیدگی سے پاک، تحریر تجسس و تقصادم بقدر ضرورت، کہانیوں کا عام فہم اختتام قاری سے بے جا خطابت نہ ہی کسی خاص نظریہ کی اشاعت یہ تمام اوصاف انہیں سہل مگر موثر افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔

اردو میں ہمیشہ اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی ہے کہ ادب کو مقصدی ہونا چاہیے یا نہیں؟ اسی سوال نے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو مشہور نعرے پیدا کیے اور اسی سوال نے ایہام گوئی سے مابعد جدیدیت تک مختلف رجحانات اور تحریکات کی بنیاد رکھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کوئی بھی تخلیق یا فن پارہ بغیر کسی مقصد کے وجود میں آئی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فن پارے جدیدیت کے دور میں لکھے گئے اور جن کا بظاہر زندگی یا افادیت سے دور دور کا رشتہ نہ تھا، اُن میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے اور وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق دانی کھلے طور پر ادب کے مقصدی ہونے کے قائل ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کی طرح سماجی، معاشرتی اور خاندانی اصلاح کے لیے ادب کو ہتھیار بنانے کے طرف دار ہیں۔ ان کا نیا افسانوی مجموعہ ”اندر کی باتیں“ کا ہر قصہ اُن کی اسی فکر کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اس مجموعے کی تمام کہانیوں میں صحت مند قدروں کی عکاسی کی ہے اور انسان کے دکھ درد، محرومیوں، نا کامیوں اور اس کے زوال کا

مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سچ یہ ہے کہ مشتاق وانی اپنے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں عصر رواں کے تمام زخموں کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ ان میں ناامیدی، مایوسی اور کم حوصلگی کے اندھیرے نہیں ملتے بلکہ حوصلے، ہمت اور کامیابی کی وہ روشنی ملتی ہے جو قاری کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ ان کہانیوں کے چند عنوانات سے ہی مشتاق وانی کی فکر اور ان کے موضوعی انسلالات کا اندازہ ہو جاتا ہے مثلاً ”جسم خور کیزا“، سرگوشی، باغی، فتنہ، پانچ سال کا بن باس، ایک اہم سوال، چھپا سانپ، چہرہ چھپائے لوگ، آنکھوں کی عصمت دری، بابا کو کچھ ہو گیا ہے، باہر اور اندر کا منظر، اندر کی باتیں“ وغیرہ۔ یہ سب ایسی کہانیاں ہیں جو بغیر کسی ابہام و اہمال کے سادہ اور سلیس انداز میں اپنا پیغام ذہنوں پہ ثبت کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے پلاٹ کو معمہ نہیں بناتے اور نہ بیانیہ کو چیتاں میں تبدیل کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں شروع سے آخر تک ایک واضح اور روشن راستہ بناتی ہیں جن پر قاری خرماں خرماں اپنا سفر طے کر سکتا ہے۔

ناقدین کے شور شرابے سے دور ہو کر مشتاق وانی خود اپنی صحبت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی فکر، اپنے خیال کو کہانی کی بنیاد بناتے ہیں۔ ان کے بیانیہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، انکی کہانیوں کے تعلق سے آپ کی اپنی پسند ناپسند ہو سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی اچھی، کوئی بری اور کوئی بہت اچھی یا بری بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جو ایک وصف ان کہانیوں میں مشترک ہے وہ اپنی سوچ اور تجربہ پر انحصار اور اس کا شخصی اظہار ہے۔ ان میں سب کی اپنی پہچان اور اپنا چہرہ ہے جو مشتاق وانی کی انفرادی شناخت پر اصرار کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ مشتاق وانی بہت حد تک قصہ گوئی کے فن سے واقف ہیں۔ زندگی میں رونما ہونے والے نوع بہ نوع واقعات کا انہوں نے نہ صرف گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے بلکہ خود اس کی تہ میں اتر کر اس کی تہ داریوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ ان کی یہ دریافت ان کے احساسات سے اس شدت کے ساتھ مگراتی ہے کہ وہ خود کو قلم و قسطاس کا سہارا لینے پر مجبور پاتے ہیں۔ اور جب جب یہ نوبت آتی ہے ان کا قلم کاغذ پر تلخ حقائق کا

ایک جنگل ترتیب دیتا ہے جہاں خار و خس برائے نام ہیں اور گل بوئے افراط سے بچے ملتے ہیں۔ فنی طور پر مشتاق وانی اپنے افسانوں میں بے جا طوالت سے گریز کرتے ہیں اور عبارت میں الجھاؤ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ زبان پر عبور حاصل ہے اس لیے پاک صاف، ہشتہ اور خوبصورت بیانیہ دل کو موہ لیتا ہے۔ مگر موضوع سے گہری وابستگی اور اصلاحی درس پہ زور کی وجہ سے واقعات فنی طور پر کہیں کہیں کہانی بننے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ افسانہ ایک تخلیقی فن ہے جو تخلیقی و فور، صنایعی اور کرافٹ مین شپ کا بھی تقاضہ کرتا ہے۔ فنکاری و صنایعی کی ایک ہلکی سی کمی کے باوجود یہ مجموعہ گرم جوشی کے ساتھ استقبال کے قابل ہے کہ یہ ایک سوچتے ہوئے ذہن، مضطرب و حساس دل اور با اسلوب قلم کار کی ادبی کاوش ہے۔



ڈاکٹر رغبت شمیم ملک

(جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

08715930191

مشاق احمدوانی کا افسانہ ”اندر کی باتیں“

(قرأت اور ردِ تشکیل)

مشاق احمدوانی ایک سنجیدہ نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ’ہزاروں غم‘ اور ’میٹھا زہر‘ منظر عام پر آچکے ہیں۔ تازہ مجموعہ ’اندر کی باتیں‘ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انہوں نے جدید ادبی تھیوری ’تانیثیت‘ پر نہایت سنجیدہ تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی کام اردو میں ’تانیثیت‘ کا روشن چراغ ہے۔ بعد ازاں ان کے ہی تانیثی چراغ سے مزید چراغوں کے جلنے کا امکان ہے۔ ان کے ہاں تخلیقی اور تنقیدی دونوں دھارا میں مسلسل اور متوازی طور پر بہہ رہی ہیں۔ مشاق احمدوانی غالباً پچیس تیس برسوں سے اس دشت کی سیاحت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کا یہی اہم کام اور سنجیدگی فن پارہ کو جلا بخشتی ہے۔ بغیر خون جگر اور سنجیدگی کے اعلیٰ اور اچھا فن پارہ وجود میں نہیں آسکتا ہے۔ مشاق احمدوانی کے ہاں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔

مشاق احمدوانی اردو افسانہ کا منہ نہیں ہے لیکن منہ کی بے باکی اور حقیقت نگاری ان کے ہاں موجود ضرور ہے۔ ان کے افسانے ان کی ذاتی زندگی اور سماج دونوں کا آئینہ ہیں۔ وہ ذاتی تجربات اور مشاہدات سے اپنا تخلیقی بیانیہ خلق کرتے ہیں۔ زندگی اور سماج کے حقائق ان کے افسانوں میں بہ آسانی ڈھل جاتے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے محاسن

و معارف سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔

’اند رکی باتیں‘ میں چترنجن باسو، مکمل کانت، خیالورام، نریش رانا اور باہر سے آئے ایکسپرس منوج اگر وال، کل دیپ سنگھ اور کنڈن لال کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔

پروفیسر چترنجن باسو شعبہ تاریخ میں صدر شعبہ ہیں۔ وہ اپنے کالے کرتوتوں کے لئے اپنی یونیورسٹی اور قرب و جوار میں مشہور ہیں۔ شراب اور شباب کو ان کی زندگی میں اولیت حاصل ہے۔ رشوت خوری اور کرپشن میں بھی وہ ایک قدم آگے ہیں۔ شراب اور شباب کے لئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر چترنجن باسو اس کے لئے رشوت لیتے ہیں تاکہ ان کی مذکورہ خواہشات کی تکمیل ہو سکے۔ کہانی کے راوی کونریش رانا بتاتے ہیں:

”مکمل کانت میں یقین سے کہتا ہوں جتنا میں چترنجن باسو کو اندر اور باہر سے جانتا ہوں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ چترنجن باسو کو چار چیزیں بہت پیاری ہیں اور ان چیزوں کے حصول کی خاطر وہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ چار چیزیں ہیں: مدراء، دھن، ناری اور چانڈو۔“

اکیسویں صدی زن اور زر کی صدی ہے۔ جس طرح سے بھی ہو اس کے حصول میں لوگ سرگرداں ہیں۔ پروفیسر چترنجن باسو بھی زن سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرح زن کی تبدیلی کو بھی لازمی سمجھتے ہیں اور کیوں نہ ہو اس کے بغیر ان کی زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ جس توان کے لئے ایک لذیذ کھانا کی طرح ہے جس سے وہ ہر بار رجوع ہونا چاہتا ہے۔ مدراء، زر، زن اور چانڈو وہی توان کی زندگی کا حاصل ہے۔ وہ اپنی ان ہی خواہشات کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ اس کی تکمیل کے لئے انہیں چاہے جو بھی کرنا پڑے منظور ہے۔ وہ سیاست کی دنیا میں بھی اپنی گہری گرفت رکھتے ہیں۔ اپنی ریاست کے تمام اکابرین کو رام بنانے میں انہیں ید طولی حاصل ہے۔ ماڈرن سماج کے ہر ایک تال میل سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے مکروفریب سے سیاست داں ہو یا ادیب سب کو بآسانی اپنے چنگل میں پھنسانے کا گر جانتے ہیں۔

نریش رانا کے مطابق:

”کمل کانت سنو! چترنجن باسو بہت چتر آدمی ہے۔ وہ اہم سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات کو قابو کرنے کے لئے محفلیں منعقد کرتا ہے۔ پچاس روپے کا گلدستہ ہاتھوں میں تھما دیتا ہے، ڈیڑھ سو روپے کا شال کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس منافقانہ انداز سے وہ ان کے روشن ضمیر کی کلفتی دبوچ لیتا ہے۔ پھر وہ اس کی بد اعمالیوں پہ لب کشائی نہیں کر پاتے۔“

خیالورام کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ کہانی کا تانا بانا اسی کے لئے بنا گیا ہے۔ اس کی صلاحیت کے بارے میں کوئی رائے نہ رکھی جائے تو بہتر ہے۔ خیالورام یونیورسٹی میں بٹرباز کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ شعبہ کے ہیڈ کی ہر طرح سے خدمت کرتا ہے۔ وہ ان کے گھروالوں کی خدمت کا بھی خاص خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنے کام اور کارنامے سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتا ہے۔ بٹربازی اور اساتذہ کا گھریلو کام کاج ہی اس کا وصف خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی میں اسامی کی جگہ پر کرنے کا جب وقت آیا تو پروفیسر چترنجن باسو نے بھی اپنے خیالورام کا خاص خیال رکھا۔ انہوں نے ہر طرح سے اس کا تعاون کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہر کام کے پیچھے ان کا ذاتی مفاد شامل رہا ہے۔ خیالورام نے اپنی بحالی کے لئے پروفیسر چترنجن باسو کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم جمع بھی کرا دی ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

”ہم تینوں کمرے سے باہر آئے تو میں نے چترنجن باسو کو خیالورام سے الگ لے جا کر تنہائی میں اپنی جگہ پوچھا ”باسو صاحب! آپ اس خیالورام کے لئے کیوں اتنا تڑپ رہے ہیں وجہ کیا ہے؟ میں تو حیران رہ گیا یہ چکر کیا ہے؟“

چترنجن باسو نے نہایت اطمینان سے کہا:

”نریش رانا صاحب! میرے پاپوش کے تمسے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیرنے تک کون سا ایسا کام ہے جو خیالورام نے نہیں کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں اس کا خیال

نہ رکھوں تو کس کا رکھوں؟ اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے اس نے تو اپنی
جمع پونجی بھی میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی ہے اب آپ ہی کہئے
کیسے انکار کروں۔“

کھوٹے سکے کو بیچنے کا فن بھی کمال کا فن ہوتا ہے۔ لوگ باگ کھرا سونا بیچنے میں
بھی پریشان ہو جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کا مقصد علم کی توسیع نہیں، وہ علم کی دیوی کی جگہ
گنیش سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور علم کی دیوی سرسوتی کو کبھی بیچ بازار میں تو کبھی بند کمرے میں
بیچ دیتے ہیں۔ بیچنے اور خریدنے کا کاروبار آج کل بہ آسانی چلتا رہتا ہے۔ ساری چیزیں
پہلے ہی نیلام ہو جاتی ہیں۔ بعد ازاں ایک انٹرویو کا خوب صورت ڈھونگ رچا جاتا ہے ہ
بکنے والے بھی کبھی نام نہاد پروفیسر ہوتے ہیں اور خریدنے والے میں یہی وجہ ہے کہ
جامعات میں ہیڈ کی کرسی سنبھالنے کے لئے تصادم پر تصادم ہوتا رہتا ہے۔ یہی تو وہ کرسی
ہے جہاں سے گنیش سے ملاقات کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ شعبہ کے ہیڈ اپنے امیدوار
خیالورام کی پیروی کس طرح کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

”اگر وال صاحب آپ کو معلوم ہی ہے کل پورے دس بجے دارالعلوم
کے سرپرست اعلیٰ کے آفس میں شعبہ تاریخ کی اسامی کے لئے
انٹرویو شروع ہو رہا ہے۔ آپ اس میں بحیثیت ماہر تاریخ موجود
ہوں گے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ یہ نوجوان اسے سر سے پیر
تک دیکھ لیجئے اس کا نام خیالورام ہے اس کا انتخاب ہونا چاہئے۔ یہ
ہسٹری میں ایم فل، پی ایچ ڈی ہے۔ نہایت شریف، دیانت دار
اور محنتی ہے۔ اس لئے آپ کو اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھنا
ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ
پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ
اور پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ
بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔ بڑی
مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ میری آپ سے

یہ بھی گزارش ہے کہ مکمل کانت نام کا ایک امیدوار کافی پھرتیاں مارتا ہے۔ اس کا انتخاب نہیں ہونا چاہئے ورنہ میری تمام پلاننگ خاک میں مل جائے گی۔“

مکمل کانت اس کہانی کا سب سے اہم اور توانا کردار ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک اچھا امیدوار ہے۔ اس کی ڈگریوں میں ایم اے، بی ایڈ پی ایچ ڈی اور ڈی ایچ شامل ہیں۔ وہ بارہ کتابوں کا مصنف ہے وہ تیس سالوں سے تخلیقی اور تنقیدی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے سینکڑوں مضامین ملک اور بیرون ملک کے اہم رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُس کے مضامین قارئین کے حلقے میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ نریش رانا کے لفظوں میں:

”باسو صاحب! مکمل کانت نے اگر فارم بھرا ہے تو اس کی سلیکشن کی جانی چاہئے۔ وہ ایک مستحق امیدوار ہے۔ مکمل کانت کو ہم تیس برس سے ہسٹری کے اہم اور معیاری رسائل میں پڑھتے آرہے ہیں۔ مکمل کانت نے ہندوستان کی جدید تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی سے نہیں ہوسکا ہے۔ لہذا یہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہے بلکہ ایک بڑا ظلم ہے کہ حق والے کو اس کا حق نہ دیا جائے۔“

یہ عجیب اتفاق ہے کہ موجودہ عہد کے باصلاحیت اسکالروں کی بحالی نہایت کم ہو رہی ہے۔ ہر انٹرویو کا نتیجہ چونکائے بغیر نہیں رہتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بیشتر انٹرویو میں خیالورام کا ہی انتخاب ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے یہ بات غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

مشاق احمد وانی حقیقی زندگی کی کہانی گڑھنے کا فن جانتے ہیں۔ ”اندر کی باتیں“ محض ایک کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دراصل ایک انٹرویو کے ایسے کی روداد ہے۔ انٹرویو کا یہ کھیل ہر یونیورسٹی میں نہایت خاموشی سے کھیلا جاتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ کچھ لوگ خیالورام کے لئے اپنے ذہین ریسرچ اسکالر کو بھی دار پر چڑھانے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ آج جامعات میں دیا لورام بر اسکالر کم اور خیالورام بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ایک دور تھا کہ انٹرویو میں باصلاحیت لوگوں کا انتخاب زیادہ ہوتا تھا۔ اس وقت

انتخاب کرنے والوں کا حلقہ بھی علم کے جوہر سے مالا مال ہوتا تھا۔ وہ اپنے ادارے کے تیس اچھے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے۔ مونس رضا اس کی عمدہ مثال ہے۔ جنہوں نے علمی دنیا کو پن چندر، رومیلا تھاپر، نامور سنگھ، محمد حسن وغیرہ جیسی شخصیات کا انتخاب کیا۔ اور کوئی بھی شخص ان کی صلاحیت پر انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ لیکن آج صورت حال مایوس کن ہے۔ اب معیار کی زیادہ اہمیت نہیں رہی ہے۔ اب انتخاب میں ذات، نسل، مسلک، علاقہ جیسی چیزوں کا عمل دخل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آج یہ چیزیں کم و بیش ہر جامعات کا وطیرہ بن چکی ہیں۔ اب کسی بھی پروفیسر کو دیالورام یا اسکا لری نہیں خیالورام کی ضرورت ہے۔ یہی خیالورام ان کے ہر مرض کی دوا ہوتا ہے۔

موجودہ عہد میں سچ لکھنا نہایت کا مشکل ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل فکشن میں سچ لکھنا ہے۔ میرے خیال میں مشتاق احمد دانی سچے فکشن نگار زیادہ ہیں۔ زندگی ایک حقیقت ہے اور کہانی کا تعلق زندگی سے ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں کہانی ہے۔ بغیر زندگی کے کہانی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ کبھی کہانی زندگی میں ڈھل جاتی ہے تو کبھی زندگی کہانی میں۔ یہی آنکھ پھولی زندگی اور کہانی کے مابین چلتی رہتی ہے۔ کہانی انسانی خمیر اور سماج کا زائیدہ ہے۔

ہم ایک مسموم فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اب ہماری سوچ اور ہمارا طور سب کچھ زہریلا ہو گیا ہے۔ جنس اور زر کی دوڑ میں ہم بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اخلاق اور معیار کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ علم اور معیارات اب محض لغت میں کشاکش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رشوت خوری اور غلط کاری پوسٹ ماڈرن انسان کا وطیرہ بن گیا ہے۔ مصلحت پسندی، ذاتی مفادات کا بول بالا ہے۔ حق والوں کا حق چھین لیا جا رہا ہے۔ دانشوروں نے اپنا غلبہ بنائے رکھنے کے لئے نئی نسل کی زبان بندی کر دی ہے۔ سچ اور حق کی آواز بے آسانی دبا دی جاتی ہے۔ معین الدین جینا بڑے لکھتے ہیں:

”ایسے سماج میں کھرا ادب تخلیق کرنا اپنے ساتھ دارورسن کو بھی آزمائش میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ سچ بولنا گھانے کا سودا قرار پاتا ہے اور حق کا نعرہ بلند کر کے کوئی ہیرو نہیں بن سکتا۔ مصلحتوں اور ذاتی مفادات کی عشق بیچاں، آزاد خیالی اور روشن

دماغی کے بل پر خوب پھیلتی ہیں اور اصل پیڑ بے شرر رہ جاتا ہے۔ کوئی حیرت نہیں ہے کہ ہمارے یہاں دانشور ذہنوں کو تھپکیاں دینے کا کام کرتے رہے ہیں۔

جرات فکر کے بغیر اظہار کا حق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ معاشرہ فکر کو رہن رکھ لینے کے بعد اظہار کی آزادی دیتا ہے اور وسائل فراہم کرتا ہے۔ ایسے معاشرے میں دانشوری نہیں پنپ سکتی، دانشوری کا بکھان ہو سکتا ہے۔ خود اس کا ہونا معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے ہوتے انسان کو بنیادی حقوق سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔“

مشتاق دانی کی کہانی سچ بولتی ہے اور ہر سچی کہانی کی اپنی معنویت ہوتی ہے۔ میں مشتاق احمد دانی کو ان کی کہانیوں کے وسیلے سے جانتا ہوں۔ ان کی کہانیوں میں ایک رتبہ ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں خود ان کی ذاتی زندگی کا انعکاس ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ان کی کہانی سچ کو چھپاتی کم ہے، سامنے لانے کا کام زیادہ کرتی ہے۔

مشتاق دانی کی کہانی 'اندر کی باتیں' عصری حقائق کا بین ثبوت ہے۔ یہ ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ کہانی مکمل کائنات کی زندگی کا المیہ ہے۔ یہ المیہ محض مکمل کائنات کا نہیں موجودہ عہد کے ہر اچھے اسکا لرا کا المیہ ہے۔ کس نے سوچا تھا کہ اکیسویں صدی میں دنیا اتنی بدل جائے گی۔ کرپشن اور جہالت کو اس صدی کا اختصاص تسلیم کر لیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں میں کرشن چندر کے گدھوں کو باری باری بحال کرنے کی سعی کی جائے گی۔ مشتاق دانی کی کہانی میں خیالورام ان ہی گدھوں میں سے ایک گدھا ہے۔ یہ خیالورام ہندوستان کی ہر یونیورسٹی میں پایا جاتا ہے۔ البتہ ان کے نام دیگر یونیورسٹیوں میں دیگر ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک حقیقی واقعہ رقم کرتا ہوں:

پروفیسر نامور سنگھ کو بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ ہندی نے ایک میموریل لیکچر کے لئے مدعو کیا۔ پروفیسر نامور سنگھ نے وہاں ایک طویل پر مغز لیکچر پیش کیا۔ لیکچر کے دوران انہوں نے موجودہ ہندی کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی۔ مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ ادھر دس پندرہ سالوں میں جن لوگوں کی جامعات میں بحالی ہوئی ان میں باصلاحیت لوگوں کی تعداد

خال خال نظر آتی ہے۔ سامعین ان کے بارعب لیکچر سے مبہوت تھے۔ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہیں ایک نہایت سنجیدہ اور خاموش طبیعت انسان کھڑا ہوا اور نہایت مودبانہ انداز میں پروفیسر نامور سے پوچھ بیٹھا۔ سر یہ بتائیے کہ بے صلاحیت لوگوں کو جامعات میں لانے کے ذمہ دار کون ہیں؟ نامور سنگھ اس سوال سے لب بہ دندان ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی بحالی کرتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے ہی خود اپنے گھر کو جلانے کا کام ان کے سپرد کیا ہے۔ اس میں ان نااہلوں کا بھلا کیا قصور ہے۔ ہمارے نام نہاد دانشوروں نے اپنے ذاتی تعلقات اور ذاتی مفادات کے لئے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کو بھی ملیا میٹ کرنے سے گریز نہیں کیا۔ پروفیسر جاوید لکھتے ہیں:

”کئی جگہ دو اساتذہ کی تقرری میں مطالعہ، ذہانت اور صلاحیت کے بجائے جوڑ توڑ، گروہ بازی اور سکہ رائج الوقت کا عمل دخل زیادہ اہم ثابت ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید تر سماجی اور ثقافتی تقاضوں کی روشنی میں ادب کی تدریس گئے چنے شعبوں میں ہو رہی ہے۔“

دنیا پہلے بھی بدلتی تھی لیکن یہ دنیا پانچ دس سالوں میں اتنی بدل جائے گی اس کا کسی کو وہم و گمان نہیں تھا۔ آج انسانی قدریں نہایت تیزی سے مٹی جا رہی ہیں۔ برائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ جنس اور زربیشتر انسانوں کا مقدر بنتا جا رہا ہے۔ ہر چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ علم اور ہنر بے وقعت اور بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ اندھے کو علم بانٹنے کا کام دیا جا رہا ہے۔ اس کا احساس ہمارے عہد کے بیشتر دانشوروں کو ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمارے دانشور بالکل خاموش ہیں۔ وجہ چاہے اس کی جو بھی ہو۔ اردو کے سنجیدہ نقاد اور دانشور شمیم حنفی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”مہذب دنیا کے کسی بھی دور میں انسانی معاشرہ اس حد تک بے لگام نہیں ہوا تھا۔ ہم سب ایک گناہ گار معاشرے کے افراد ہیں اور ہمارا احساس گناہ ختم ہو چکا ہے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو گا کہ ہمیں اپنے انحطاط اور بے راہ روی کا اندازہ تک نہیں۔“

فلش کی سچائی بنیادی طور پر زندگی کی سچائی ہے۔ مشتاق احمد وانی خود اردو کے اسکا لریں۔ وہ بھی پروفیسری کے لئے اپنی قسمت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سانحہ خود ان کی زندگی میں پیش آیا ہو۔ جوان کی کہانی میں مکمل کانت کا دھارن کر گیا ہو۔ اور کہانی بالکل حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ مکمل کانت کا المیہ خود مشتاق احمد وانی کی زندگی کا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو مشتاق احمد وانی نے مکمل کانت کے قالب میں ڈھال دیا ہو یا یہ کسی اور اردو کے اسکا لر کا سانحہ ہو سکتا ہے جو فلش کا روپ دھارن کر گیا ہے۔

یہ محض ایک خیال و ارام کی کہانی نہیں ہے۔ یہ نام نہاد پروفیسر کے اخلاقی گراؤ کی بھی کہانی ہے۔ اے پی جے ابوالکلام نے سچ کہا ہے کہ سماج میں اگر دو لوگ صحیح ہو جائیں تو سماج سے کرپشن اور دیگر برائیاں ختم ہو سکتی ہیں یعنی والدین اور استاد۔ والدین کے ہاں خود آج اخلاقیات کا فقدان ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بھی اخلاقیات کی تعلیم دینے سے گریز کرتے ہیں۔ آج اساتذہ کا حال بھی زیادہ اچھا نہیں ہے۔ علم کی جگہ ان میں بھی مادیت تحلیل ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج سے اساتذہ کا وقار جاتا رہا ہے۔

آج اساتذہ بڑی تعداد میں اخلاقی طور پر اپنا بچ ہو چکے ہیں۔ اساتذہ جن پر کل دنیا فخر کرتی تھی آج انہیں حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ مارکیٹ کلچر کا اثر کچھ اساتذہ پر بھی حد درجہ نمایاں ہے۔ ان کو اب طالب علموں کو بہتر تعلیم سے آراستہ کرنے کی فکر نہیں ہے۔ اب انہیں اضافی آمدنی کی فکر زیادہ ہے۔ وہ اپنی اضافی آمدنی کے لئے کبھی سمینار کبھی ورکشاپ اور سبھی ریڈیو ٹیلی ویژن کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اب دولت کا حصول ہی ان کی زندگی کا عظیم مقصد ہے۔ بعد ازاں یہی اساتذہ سامیوں کے پُر کرنے کے دوران گنیش سے ہاتھ گرم کرنے میں بھی فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی ایک بیانیہ اسلوب کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی سادہ بیانی ہی میں جادو کا جوہر اور سادگی میں پرکاری ہے، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے ہمیشہ افسانے کے موضوعات کے انتخاب میں سماجی اور ذاتی زندگی کے مسائل کو فوقیت دی ہے۔ اور نہایت جرأت اور ایمانداری سے ان مسائل کو اپنے افسانوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات موجودہ افسانہ نگاروں کے

ہاں کم کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

آخر میں میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ دور چتر نگن باسو اور خیالورام کا دور ہے۔ اس دور میں مکمل کانت جیسے عالم انسان دوست، نیک اور مہذب انسان کے لئے جگہ نہیں ہے۔ مجھے دو بھند رناتھ نرگن کی کہانی 'بغیر اسلوب کی کہانی' شدت سے یاد آرہی ہے۔ اس میں ایک ریٹائرڈ افسر اپنے نیک اور ایماندار دوست سے کہتا ہے کہ 'یہ دنیا اب تمہارے جیسے سادھو لوگوں کے قابل نہیں رہی! یہاں تو میرے جیسے پاپی (گناہ گار) ہی پنپ سکتے ہیں۔'



جسم خور کیرا

”دیکھو نوری ادھر دیکھو یہ ہماری شادی کا الم ہے۔ اس میں نہ صرف میری اور تمہاری شادی کی حسین تصویریں محفوظ ہیں بلکہ میرے اور تمہارے بچپن کی تصویریں بھی اس میں موجود ہیں۔ آج ہماری شادی کی نویں سالگرہ ہے۔ ان نو برسوں میں ہم چار بچوں کے ماں باپ بن چکے ہیں۔ ہم اپنا بچپن اور لڑکپن کہاں چھوڑ آئے ہیں! وقت اپنی رفتار سے گزر رہا ہے اور اس نے ہمیں کیا سے کیا بنادیا ہے۔ تمہیں کس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ وقت کے گزراں میں میرا اور تمہارا وجود زمین میں دھنسا چلا جا رہا ہے اور ہم کوئی بھی احتجاج نہیں کر پارہے ہیں۔ اری چپ کیوں ہو کچھ تو بولو کہ یہ وقت ہمیں کہاں لے جا رہا ہے!“

غلام عباس بار بار الم میں بھی اپنی اور بیوی کی خوبصورت تصویروں کو دیکھ کر عمر رفتہ کو آواز دے رہے تھے اور ان کی بیوی نوری قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی پورے جوش و جذبے کے ساتھ اپنی شادی کی نویں سالگرہ منانے کے لئے بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ بناری ساڑھی اس کے خوبصورت سڈول جسم پر سے بار بار پھلتی جا رہی تھی اور وہ اس کے سبھی زاویے درست کرنے میں مصروف تھی۔ ساڑھی سے فارغ ہوئی تو ہونٹوں اور آنکھوں کی طرف آئی۔ ہونٹوں پہ کون سی لپ اسٹک لگائے وہ پل بھر کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے ساڑھی کے رنگ پر نظر دوڑائی۔ اس کا رنگ جامنی تھا۔ اس نے اسی رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہی رہی تھی کہ غلام عباس موونگ چیئر پر سے اٹھے، ایک ہاتھ میں الم لئے وہ بیوی کے سامنے آکھڑے ہوئے اور اس سے بولے ”دیکھو جاناں!

آخر تم کب تک وقت کے دریا میں یہ بناؤ سنگھار کرتی رہو گی! اور دیکھو یہ تمہارے اور میرے بچپن کی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں میں کتنی معصومیت ہے۔ ہم اپنے جسمانی خدو خال کو پرکشش بنائے رکھنے کی کتنی فکر اور کوشش کرتے ہیں مگر سب بے سود!“

نوری اپنے شریک زندگی کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی:

”تمہاری فلسفہ طرازی مجھے کبھی کبھی بہت مایوس کر دیتی ہے۔ چھوڑیے ان

باتوں کو مجھے یہ بتائیے کہ میں اس وقت آپ کو کیسی لگ رہی ہوں۔“

”دلہن جیسی دکھائی دے رہی ہو مگر..... میں آگے کیا کہوں۔“

نوری کے لبوں پر مسکان سی بکھر گئی وہ بولی:

”کیسے نا آگے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“

غلام عباس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے ”نوری! مجھے وقت کے گزرنے کا

احساس اندر ہی اندر نوچتا اور جھنجھوڑتا ہے کبھی کبھی یہ تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش! وقت کی

رفتار تھم جائے اور تغیر نام کی کوئی بھی چیز دنیا میں نہ رہے۔ میں جوان رہوں اور تم بھی جوان

رہو! ہم دونوں حسن و عشق کی ڈور میں یوں بندھے رہیں کہ یہ ڈور کبھی ٹوٹنے نہ پائے! مگر یہ

سب کچھ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وقت کے آگے بے بس و مجبور ہیں! کیونکہ وقت جیسے

دیوبید کل کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹک سکا ہے۔ اس نے آج تک سب کو تہس نہس کر دیا ہے۔

یہ بڑی بے دردی سے سب کو روندنا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ سچ

کہتا ہوں شادی کے موقع پر تم بہت حسین و جمیل تھیں۔ شادی کے بعد تمہارا حسن ماند

پڑ گیا۔ تمہاری لمبی گھنیری ڈلفوں میں چاندی جیسی سفیدی آگ آئی ہے۔ تم اس سفیدی کو

سیاہی میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہو مگر وقت صداقت کی لالچی سے ہر کھرے کھوٹے

کی نشاندہی کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ تمہارے موتی جیسے دانتوں میں نیلا پن ڈر آیا ہے لگتا ہے

انہیں اندر ہی اندر کوئی کیڑا برباد کرنے میں لگا ہے۔ تمہارے جسم کی وہ تمام دلکش رعنائیاں

اور وہ تمہارا اندازِ دلِ ربانی آخر کہاں گیا؟ نوری ہم سب ذمہ دار یوں کے بوجھ تلے اس قدر

دب جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ کا بھی علم نہیں رہتا۔ وقت نے ہمیں کس مقام پر لاکے کھڑا

کیا ہے اور آخر کار ہمارا انجام کیا ہوگا؟ ذرا سوچو تو سہی۔ دیکھو تم میری باتیں سن کر مایوس

ہو رہی ہو۔ اچھا چھوڑ دینا یہ باتیں یہ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگ رہا ہوں؟“ نوری نے کہا:

”مجھے تو آپ ایک خزاں رسیدہ پیڑ کی مانند دکھائی دے رہے ہیں یعنی جوانی آپ سے رخصت ہو چکی ہے اور بڑھاپا آپ کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ آپ کے چہرے پر جھریاں سی ابھرا آئی ہیں اور بالوں میں سفیدی بڑھاپے کا اعلان کر رہی ہے۔ آپ کوئی بھی تحریر بغیر عینک کے نہیں پڑھ پاتے ہیں لیکن میرا یہ سناؤ سنگھار پھر بھی آپ ہی کے لئے ہوتا رہے گا۔ آپ سدا سلامت رہیں آپ کو ہر وقت خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

غلام عباس نے کہا:

”نوری! میں واقعی تمہارے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا ہوں اور تم بھی میرے بغیر ادھوری ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ تمہارا میرا ساتھ اور یہ رشتہ آخر کب تک؟ کیونکہ جسم خور کیڑا مسلسل ہمیں کھائے جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کیڑا ہے جو نظر نہیں آتا، کاش! یہ نظر آتا تو اسے ہم بُری طرح مار دیتے! یہ ہماری زندگی کا ازلی دشمن ہے۔ اس نے ہم سے ہمارا بچپن اور لڑکپن بُری طرح چھین لیا ہے اور اب ہماری جوانی ہم سے چھیننے لگا ہے۔ مجھے بڑھاپے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ نوری! ایک دن آئے گا یہ جسم خور کیڑا ہمارے وجود کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ یقیناً جانو یہ ہماری تمام جسمانی قوتوں کو چاٹ جائے گا!“

نوری نے کہا:

”ابھی میری زندگی کے ارمان باقی ہیں۔“

غلام عباس نے پوچھا ”کیا ارمان ہیں تمہارے؟“

”ایک یہ کہ ہمارا ایسا خوب صورت مکان ہو جس کے لان سے مختلف پھولوں کی خوشبو آتی رہے اس کے علاوہ چھماتی آلو گھاڑی ہو اور یہ کہ بڑا اینٹا ڈاکٹر بنے، اس سے چھوٹا انجینئر، تیسرا اینٹا کے۔ اے۔ ایس آفیسر اور سب سے چھوٹا بیٹا پائلٹ بنے۔“

غلام عباس ہنس پڑے اور کہنے لگے:

”خدا کرے نوری تمہارے یہ ارمان پورے ہوں لیکن یاد رکھو زندگی ایک غیر یقینی سفر ہے۔ یہ نہ تم جانتی ہو اور نہ میں جانتا ہوں کہ زمین و آسمان کے صندوق میں ہم کب

تک رہیں گے۔ رہی بات ارمانوں کی تو ارمان اس دنیا میں کسی کے بھی پورے نہیں ہوتے ہیں۔ انسان کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری سرا بھارنے لگتی ہے اور یہ رشتے ناطے سب جھوٹے ہیں میری نظر میں یہاں سب اپنے مطلب کے یار ہیں۔“

نوری نے پوچھا:

”تو کیا میرا اور آپ کا رشتہ بھی جھوٹا ہے؟“

”ہاں یہ بھی کسی حد تک جھوٹا ہے۔ اس لئے کہ جب میاں بیوی بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ چاہت کا یہ سلسلہ نفرت میں بدل جاتا ہے اور دونوں کو اپنے ناکارہ وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ تو ت برداشت ختم ہو جانے کے سبب معمولی معمولی باتوں پر جھگڑنے لگتے ہیں۔“

اچانک غلام عباس کی نظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے قومی شاہراہ پر پڑی تو انہوں نے لالہ مدن گوپال کو اپنی بیوی کملا دتی کے ساتھ ٹپلتے ہوئے دیکھا۔ دونوں بوڑھے ہانپتے کانپتے گرتے سنبھلتے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سڑک پر ٹھل رہے تھے۔ جوانی نے انہیں بڑھا پے کے حوالے کر دیا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں موٹے شیشے کی عینک لگی ہوئی تھی۔ کمر جھکی ہوئی، بال بالکل برف کی مانند سفید ہو چکے تھے۔ دونوں بڑھا پے کی ڈراونی صورتیں لئے آہستہ آہستہ سڑک پر چل رہے تھے۔ غلام عباس نے کہا:

”نوری میرے قریب آؤ وہ دیکھو۔“

”کیا ہے؟“ نوری نے پوچھا۔

غلام عباس نے کہا:

”وہ دیکھو ہمارے شہر کا امیر ترین آدمی لالہ مدن گوپال آج کس بے سروسامانی کے عالم میں ہیں۔ یہ وہی مدن گوپال ہیں جو کئی فیکٹریوں، کارخانوں اور گاڑیوں کے مالک تھے لیکن آج جسم خور کیزے نے ان کا کیا حال بنا رکھا ہے! میں لالہ مدن گوپال کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ کئی بار مجھے اپنی روداد غم سنا چکے ہیں۔ اپنے تین بیٹوں کے روشن مستقبل کے لئے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے لیکن آج ان کے پتھر دل بیٹے اپنی بیویوں کے بہکاوے میں آکر اپنے بوڑھے والدین کو ایک بھاری بوجھ سمجھ کر انہیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔“

نوری نے غلام عباس سے پوچھا۔

”اس بوڑھے آدمی کے ساتھ یہ بوڑھی ضعیف عورت کون ہے؟“

غلام عباس نے کہا:

”یہ کملاوتی ہے، لالہ مدن گوپال کی بیوی۔ یہ ایک زمانے میں انتہائی حسین عورت تھی اور مدن گوپال خود بھی بہت خوبصورت اور فولادی وجود کے حامل تھے، لیکن وقت کے دریا میں بہتے بہتے یہ دونوں میاں بیوی آج اس حال میں پہنچ چکے ہیں۔ آج یہ بے سہارا اور محتاج ہیں۔“

نوری نے حیران ہو کر غلام عباس سے پوچھا:

”تین بیٹے ہونے کے باوجود اتنے بڑے امیر ترین میاں بیوی کا یہ حال! ایسا کیوں ہے؟“

سنو نوری لالہ مدن گوپال نے ایک دن مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی۔ کہنے لگے:

”بیٹا میرے تین بیٹے ہیں۔ بیٹی کوئی نہیں ہے، تینوں کو بڑے ناز و نعم میں پڑھایا لکھایا۔ بڑا بیٹا فوج میں برگزیدہ ہے۔ دوسرا تحصیلدار ہے اور تیسرا آپ کے شہر کا سب سے بڑا بزنس مین ہے۔ بڑے بیٹے کی شادی کی کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی بیوی کے ہمراہ مدراس چلا گیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ بھی ہم سے الگ ہو گیا اور جب تیسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ تین سال تک ہمارے ساتھ رہا۔ اس کے دو بچے ہونے کے بعد وہ اور اس کی بیوی ہم سے نفرت کرنے لگے۔ محض اس بات پر کہ مجھے رات کو کھانسی آتی تھی اور میری کھانسی کی وجہ سے ان کے بچوں کی نیند میں خلل پڑتا تھا چنانچہ تین سال کے بعد وہ بھی ہم سے الگ ہو گیا۔ میری کروڑوں روپے کی پراپرٹی پر جب میرے بیٹے لڑنے جھگڑنے لگے تو میں نے سب کچھ ان میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے میری ہر چیز کو سنبھال لیا لیکن ہم بوڑھوں کو انہوں نے نہیں سنبھالا! وہ ہمیں تقسیم نہیں کر سکے۔ بیٹے ہم تو چتا تک ایک دوسرے کے ساتھ جائیں گے۔ میری بوڑھی کملاوتی بڑی مشکل سے میرے اور اپنے لئے دو وقت کا کھانا تیار کر لیتی ہے لیکن بیٹا اب شاید ہم دونوں بہت جلد ”وردھ آشرم“ میں داخلہ لیں گے کم از کم زندگی کے کچھ دن کسی کی دیکھ بھال میں تو گزر جائیں! آخری جملہ کہتے

ہوئے لالہ مدن گوپال کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے نوری!“۔

نوری نے بڑے افسردہ لہجے میں غلام عباس سے پوچھا:

”تو کیا ہم بھی بوڑھے ہو جائیں گے؟ کیا بڑھاپے میں اولاد ماں باپ سے نفرت کرنے لگتی ہے اور کیا یہی عمر دھکے کھانے کی ہوتی ہے؟“

”ہاں نوری! ایک وقت آئے گا ہم بوڑھے ہو جائیں گے اتنا ہی نہیں بلکہ جسم خور کیڑا ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بوڑھوں سے ہر کوئی نفرت کرتا ہے۔“

یہ باتیں سن کر نوری نے جھٹ سے غلام عباس کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے کر زور سے بھینچا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑی۔ وہ زندگی ہوئی آواز میں بولی:

”جدائی کی بات نہ کرو بالم میرا دل گھبراتا ہے۔“

غلام عباس نے کہا:

”نوری مجھے قبر کی تاریکی یاد آتی ہے تو ڈر جاتا ہوں!“

سورج غروب ہو رہا تھا اور دور کہیں ریڈیو پہ یہ گانا بج رہا تھا!

کبھی تیرا دامن نہ چھوڑیں گے ہم

چاہے زمانہ کرے لاکھوں ستم

ہائے کبھی تیرا دامن.....



سرگوشی

وہ دونوں اپنے محلے میں خوشحال اور گوپال کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بچپن سے دونوں نہایت شرارتی، کام چور اور بہت حد تک مُفسد تھے۔ قد اور عمروں میں کوئی بھی تفاوت نہ تھا۔ ایک محلے کے کتے کو دوسرے محلے کے کتے سے لڑاتے یا کُغنی دار مرغوں کو پکڑ کر انہیں ایک دوسرے کے قریب رکھتے۔ مرغے آپس میں اُچھل اُچھل کر ٹھونگیں مارتے مارتے جب لہو لہان ہو جاتے تو یہ دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ انہیں اس طرح کے یہ خونی کھیل پسند تھے۔ والدین نے بڑے شوق سے ان کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ پڑھ لکھ کر نہ صرف اپنے والدین اور خاندان کا نام روشن کریں گے بلکہ پورے علاقے کو وقار بخشیں گے، لیکن اپنی شرارتی ذہنیت کے باعث یہ دونوں دسویں سے آگے نہیں جاسکے تھے۔ استادوں، والدین اور خاندان کے بزرگوں کی لعن طعن اور ڈانٹ ڈپٹ کا ان پہ کوئی بھی اثر نہیں ہوتا تھا، نہ معلوم کس مٹی سے ان کا خمیر تیار ہوا تھا۔ اب یہ جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود سنجیدگی نام کی کوئی بھی چیز ان میں نہیں آئی تھی۔ کبھی ان کے والدین یہ چاہتے کہ دونوں کی شادی کر دیں تاکہ ان کی خرمستی سنجیدگی میں بدل جائے مگر یہ خیال آتے ہی وہ دل مسوس کے رہ جاتے کہ ایسے نکلتے اور ادبаш قسم کے لڑکوں کی شادی کرانا کسی کی بیٹیوں کو سولی پہ چڑھانے کے مترادف ہے!!

آج اتوار تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے ایک وسیع دمریض اور دلکش پارک میں پہنچ چکے تھے۔ تقریباً ہر عمر کے مرد و عورتیں چنبیلی، بڑگس، جنگلی موتیا، چھوٹی موٹی، گیندے، رات کی رانی اور سرخ و سفید گلاب کے پھولوں کی بھینی بھینی

خوشبو سے اپنے دماغوں کو معطر کر رہے تھے۔ پوری پارک میں کل آٹھ چنار کے پیڑ ترتیب وار نصب تھے جن کی گھنی چھاؤں میں ہر شخص تازگی اور راحت محسوس کرتا۔ ان کے علاوہ دیودار اور مور پنکھ کے چھوٹے چھوٹے پیڑ پارک کی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ سیر و تفریح کرنے والوں کو اپنی طرف راغب کر رہے تھے۔ پوری پارک میں چاروں جانب پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ لوہے کے خوشنما بیچ لگے ہوئے تھے۔ محمد خوشحال اور گوپال دت دونوں دوست ایک بیچ پہ بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں بعد ایک غیر شادی شدہ جوڑا ان کے سامنے دور ایک بیچ پہ بیٹھ گیا۔ لڑکی نہایت خوبصورت اور دلکش اداؤں کے ساتھ جھومتی مسکراتی اپنی پسند کے لڑکے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ لڑکا بھی قد آور اور پُر رونق چہرے مہرے والا تھا۔ دونوں کے دلوں میں نہ جانے کب سے ایک دوسرے کے تئیں پریم رس کی دھار آنے پھیل چکی تھی۔ لڑکے نے اپنی جیب سے نہایت خوبصورت اور قیمتی موبائل سیٹ نکالا، اپنی محرومی انگلی سے اسے ایک دو بار چھوا اور موبائل میں یہ نغمہ گونج اٹھا:

دنیا والوں سے دور چلنے والوں سے دور
آ جا آ جا چلیں کہیں دور کہیں دور کہیں دور

لڑکی نغمے کی دھن پر سر دھننے لگی اور پھر بے ساختہ لڑکے کی آغوش میں اپنا سر رکھ دیا۔ لڑکا اس کی زلفوں کو ہاتھ سے سنوارنے لگا۔ دونوں محبت اور چاہت کے نشے میں محمور دنیا و مافیہا کو بھول بیٹھے تھے۔ محمد خوشحال اور گوپال دت ان دونوں پیار کرنے والوں کو حسد و رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب نظارہ کچھ زیادہ ہی دلچسپ اور رنگین ہو گیا تو محمد خوشحال نے گوپال دت کو کہنی سے ہلکوارہ مارتے ہوئے کہا:

”یار گوپال! میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان دو پیار کرنے والوں کو دنیا کی کوئی بھی طاقت جدا نہیں کر سکتی ہے۔“

گوپال دت نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ارے یار کیا بات کر رہا ہے تو، یہ کام تو میں دو منٹ میں کر سکتا ہوں۔“

محمد خوشحال نے متعجب انداز میں پوچھا۔

”میرے دوست! وہ کیسے؟ میری نظر میں تو یہ ناممکن ہے۔“

گوپال دت نے کہا۔

”میرے دوست تُو دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس غیر شادی شدہ جوڑے کے بالکل قریب پہنچ گیا، یہ دونوں اسے اپنے قریب آتے دیکھ چوکنے اور پھر تھوڑا سنبھل کے بیٹھ گئے۔ گوپال دت نے بڑے ادب اور انکساری سے کہا۔

”بھائی صاحب! میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے مجھ بھر کے لئے میری بات سن لیجئے۔“

عاشق مزاج نوجوان نے کہا۔

”جی کہئے۔“ اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی ہکا بکارہ گئی۔ اس کے دماغ میں حیرت کی بجلی کوندنے لگی۔ گوپال دت نے اس خوبصورت نوجوان کو چند گز کے فاصلے پر ایک طرف لیا اور اس کے کان میں بالکل آہستہ سے کہا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اس جوان نے کہا ”کہئے نا۔“

گوپال دت نے ہنستے ہوئے کہا ”اچھا اب نہیں کہوں گا۔“ بس اتنی سی بات کہہ کے گوپال دت واپس اپنے دوست محمد خوشحال کے پاس آیا اور اسے کہا۔

”اب تماشہ دیکھنے کے لئے تیار ہو جا، مگر یہاں پہ بیٹھنا اب ہمارے لئے مناسب نہیں، چلو دور سے ان کا تماشہ دیکھتے ہیں۔“

عاشق مزاج نوجوان کو دل ہی دل میں گوپال دت پہ غصہ آ رہا تھا، وہ جب اپنی محبوبہ کے پاس پہنچا تو محبوبہ نے بڑے مضطرب لہجے میں اپنے عاشق سے پوچھا۔

”یہ اجنبی شخص آپ کو کیا کہہ رہا تھا؟“

”اری یہ کوئی پاگل لگتا ہے، اس نے تو مجھے کوئی بھی بات نہیں سنائی۔“

لڑکی کا لہجہ فوراً تلخ ہو گیا وہ بولی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی آپ کو میری نظروں کے سامنے مجھ سے الگ لے جا کر ایک ضروری بات سن رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ تو آپ مجھ سے سراسر جھوٹ کہہ رہے ہیں۔“

لڑکے نے یقین دلاتے ہوئے کہا ”میں سچ کہہ رہا ہوں اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا۔“

لڑکی کے دل و دماغ میں شک کی سوئی گھومنا شروع ہو گئی اس نے کہا۔
 ”میں پوچھ رہی ہوں وہ کیا کہہ رہا تھا؟ آخر مجھ سے آج آپ یہ بات کیوں چھپا رہے ہیں۔“

لڑکے نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔
 ”میں کہہ رہا ہوں اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا..... کچھ نہیں کہا..... کچھ نہیں کہا..... تمہیں مجھ پہ یقین نہیں رہا؟“
 لڑکی نے بھی غصے میں کہہ دیا۔

”ہاں مجھے تم پہ یقین نہیں رہا۔ نو مہینے میں، میں نے تم سے اپنے جسم و جان و دل کی کوئی بھی چیز اور بات نہیں چھپائی لیکن آج تمہاری اصلیت میرے سامنے آ گئی، بس میری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ۔“ لڑکی نے غصے کی حالت میں ایک دم اپنے پرس سے اپنے عاشق کا فوٹو نکالا اور اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس کی طرف پھینک دیا۔

لڑکے نے جب اپنی تذلیل کا یہ بھیانک رخ دیکھا تو اس نے بھی کہہ دیا۔
 ”تو کسی ذلیل اور کمینے خاندان کی ہے، یہ مجھے آج معلوم ہوا۔“
 لڑکی نے جب یہ سنا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی، اس نے فوراً اپنی اونچی ہیل والی چپل پاؤں سے نکالی اور لٹکارتی ہوئی بولی

”میرے خاندان کی بات نہ کرنا ورنہ اس سے تیرا سر گنجا کر دوں گی۔“ ان دونوں کی ٹکراؤ دیکھ کر لوگ ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ لڑکے نے چاہا کہ وہ گوپال دت کو پکڑے اور اس کا سر قلم کر دے، اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں لیکن گوپال دت اور محمد خوشحال دونوں مفسد روپوش ہو چکے تھے۔



باغی

اس کا نام جیون داس تھا، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، بے حد ذہین اور خوبصورت تھا۔ آٹھویں جماعت ہی سے کئی شوخ و چنچل قسم کی حسینائیں اس پہ فدا تھیں مگر وہ بھی بڑے کٹھن دل کا تھا۔ اس نے نامعلوم یہ راز کیسے جان لیا تھا کہ ایک طالب علم کا کسی حینہ سے عشق کرنا اس کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنا تعلیمی سفر پھونک پھونک کر طے کیا تھا۔ مگر بالآخر جب وہ کمیسٹری میں ایم ایس سی کر رہا تھا تو کوئل نام کی لڑکی نے اپنے حسن اور عشق کی تپش سے اسے موم بنا دیا تھا۔ وہ خود تو برہمن زادہ تھا اور کوئل رام داسی تھی لیکن محبت، ذات پات، اونچ نیچ، دین دھرم اور امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بنا داس رہتے تھے، پھر ایک دن انہوں نے تمام خاندانی اور سماجی بندھنوں، رسموں، رواجوں اور عقیدوں کی پرواہ کئے بغیر کورٹ میرج کر لی۔ کوئل کے ماں باپ نے اس کے اس جرات مندانہ اقدام پر کوئی خاص ناراضگی ظاہر نہیں کی کیونکہ وہ کسی حد تک اس بات پر فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک برہمن زادے کو اپنا عاشق بنانے میں کامیاب ہوئی ہے مگر جیون داس کے والدین نے جب اپنے بیٹے کا یہ انوکھا کارنامہ سنا تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے چہروں پر کالا پوت دی ہو۔ ہر ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے یا بیٹی کی برات سجے، ڈولی اٹھے اور اپنے پرانے کبھی شادی جیسے پرست موقع پر مدعو کئے جائیں، گیت گائے جائیں اور جشن منایا جائے۔ جیون داس کے والدین نے بھی دل ہی دل میں اس کی شادی کے کئی ارمان پال رکھے تھے۔ مگر اس نے ان کی تمناؤں کا کوئی بھی خیال نہ

رکھتے ہوئے کوئل جیسی سچ ذات کی حسین و جمیل اور سلیقہ شعار لڑکی کو اپنی بیوی بنالیا۔ دراصل جیون داس بچپن ہی سے آزاد خیال اور باغیانہ طبیعت کا حامل تھا۔ وہ کرم دھرم اور ذات پات پہ بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ جب وہ سماج میں ذات پات میں بنے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم اور تصادم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلنی ہو جاتا اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضاءِ بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک ایک منہ، ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں بالکل سرخ رنگ کا تو پھر یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بنایا انسان آخر کیوں؟ ایکشن کے دوران جب نیا لوگ سفید لباس میں ملبوس اپنا ووٹ بینک بنانے کی خاطر دھرم اور مذہب کی آڑ لے کر عوام کے جذبات و احساسات سے کھیلنے اور اس طرح لی تقریریں کرتے۔

”میرے دلش واسیو! اپنے اندر جا گرتی پیدا کرو، ہندو دھرم خطرے میں ہے، ہندو وہی ہے جو اپنے دھرم اور دلش کی رکھشا کرے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ بھارت میں رام راجیہ قائم کیا جائے۔“
دوسرا نیا مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے اس طرح کی زہر افشانی کرتا:
”میرے مسلم بھائیو اور بہنو! اسلام خطرے میں ہے اور تم غفلت کی نیند میں سوئے پڑے ہو۔ کل خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے، ہم مسلمان ہوتے ہیں اور تمہیں پتا ہی نہیں کہ مسلمانوں کے کیا کام ہوتے ہیں۔ اب کی بار مجھے کامیاب کراؤ گے تو اسلام گھر گھر میں داخل کراؤں گا، امن و چین کی زندگی جیو گے۔“

سیاسی نیاؤں کی یہ اشتعال انگیز تقریریں سنتے وقت جیون داس کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے کسی خاص جرم کی پاداش میں ایذا رساں آدمی اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا ہو۔ کبھی کبھی وہ کافی جذباتی ہو جاتا، تب اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کو لٹا کر کہے کہ چھوڑ دو یہ دھرم، مذہب، ریتی رواج، ذات پات، فرقہ پرستی اور چھوٹ چھات کے تمام

ڈھونگ اپنے اپنے خول سے باہر نکل آؤ، دھرم مذہب ذات پات سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جاؤ، چھوٹی ہی عمر سے اس کے دل میں یہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور آج اس نے کوئل جیسی نیچے ذات کی لڑکی سے شادی کر کے ذات پات، چھوت چھات اور اونچ نیچ کی تمام دیواریں توڑ دی تھیں۔ وہ آج اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ کیمسٹری میں ایم ایس سی ہونے کی حیثیت سے وہ ہر چیز کو سائنٹیفک طریقے پر جانچنے پر کھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ سماجی بندشوں، رسموں، رواجوں اور دین دھرم کی صداقت سائنٹیفک طریقے پر معلوم کرے مگر اسے اپنے تمام تجربات و مشاہدات سے یہ سب انسان کی انانیت، غریبوں کا استحصال اور توہم پرستی کی بھیما تک صورتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ مغربی فلسفہ اور سائنسدانوں کے کارناموں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ سقراط، افلاطون، ارسطو، کارل مارکس، فرائڈ، ڈارون، یونگ، نطشے، جان اسٹارٹ مل کے علاوہ گلیلیو، کوپرنیکس، نیوٹن، گراہم بیل، رائٹ برادرز، مارکونی، تھامس ایڈیسن، اور چارلس بیچ کے کارناموں سے بے حد متاثر تھا۔ اس لئے وہ ہر چیز کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کا قائل تھا۔ سائنس اس کے دماغ میں اس حد تک گھس گئی تھی کہ وہ تمام سماجی، اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقدار کو انسان کی خود غرضی سے تعبیر کرتا تھا۔

کورٹ میرج کے فوراً بعد جیون داس اور کوئل ہنری مون منانے مسوری اور بنی تال چلے گئے۔ دس دن کے بعد جب جیون داس اپنی شریک زندگی کے ساتھ اپنے والدین کے لئے بہت سے تحفے لے کر گھر پہنچا تو اس کی ماں گھر کے آگن میں بیٹھی اپنی قسمت کا رونا رو رہی تھی اور اس کا باپ واسد یو ایک کمرے میں بستر پر لیٹا اس گھڑی پر کف افسوس مل رہا تھا کہ جب اس نے جیون داس کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ غم و غصے سے اس کا دماغ ابل رہا تھا۔ جیون داس مسکراتے ہوئے ماں کی طرف بڑھاتا کہ اس کے چرن چھوئے اور آداب بجالائے۔ مگر ماں اسے دیکھتے ہی ایک پھری ہوئی شیرنی کی طرح دور ہٹ گئی اور بولی ”مجھ سے دور ہو جا تو میرا بیٹا نہیں ہے تو نے پورے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ میرا دھرم بھر شٹ کرے گا۔ نکل جا یہاں سے اور اس چمارن کو بھی میری نظروں سے دور لے جا۔“

ماں کی اس حقارت آمیز رویے پر جیون داس اور اس کی بیوی کوئل بالکل ناراض نہیں ہوئے بلکہ دونوں زور سے ہنس پڑے جیون داس نے کہا۔

”ماں جی! آپ بلاوجہ ناراض ہو رہی ہیں۔ اپنی مرضی سے شادی کرنا میرا حق تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہم سب انسان ہیں، ہم پڑھے لکھے لوگ چھوٹ چھات اور ذات پات پر یقین نہیں رکھتے“ پھر اس نے کوئل سے کہا:

”کوئل جاؤ! میری ماں کا منہ میٹھا کراؤ۔“

کوئل نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور ایک پیس ہاتھ میں اٹھا کر اپنی ساس کی طرف بڑھی۔ پتلون اور جیکٹ میں اس کا سڈول جسم کچھ زیادہ ہی دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جیون داس کی ماں دیر تک اسے دھتکارتی ہوئی ”دور ہٹ دور ہٹ“ کہتی رہی اور کوئل بھی اس کے پیچھے ہستی مسکراتی دوڑتی رہی۔ دیر تک ساس بہو کی آنکھ پچولی پر جیون داس ہنستا رہا اور پھر دونوں نے زبردستی ماں کو پکڑ کر مٹھائی کھلا دی لیکن وہ تھو تھو کرتی رہی۔ جیون داس نے اسے منانے کے لئے دوسرا حربہ استعمال کیا اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ماں جی میں آپ کا بیٹا ہوں بھگوان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔“

میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں مجھے غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔“

پھر اس نے ماں کے پاؤں پکڑ کر اپنا چہرہ ان پر رکھ دیا تو ماں کا دل پسج گیا۔ وہ رونا بھی، اس کے بہتے آنسو دیکھ کر جیون داس بھی رو پڑا۔ یہ سب منظر دیکھ کر کوئل کی آنکھوں میں بھی آنسو اُڈ آئے۔ پھر معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسی دوران جیون داس کا باپ واسد یو اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اپنے بیٹے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ باپ کا ناخوشگوار رویہ دیکھ کر جیون داس کچھ دکھی سا ہو گیا۔ اپنے دکھ سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے رات کو تھوڑی سی دھسکی پی اور سو گیا۔ واسد یو نے بیوی کو بڑے غصے سے پوچھا:

”تم نے اس شودر کو کیوں گھر میں داخل ہونے دیا۔ اسے بول کہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا کہ میری نظر میں اسے کبھی دیکھ نہ پائیں۔“

جیون داس کی ماں خاموش رہی۔ وہ کیا کہتی وہ خود اندر ہی اندر ٹوٹ گئی تھی اور

بھگوان سے اپنی موت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ جیون داس ماں باپ کی ناراضگی اور ان کی محدود سوچ پر کافی دکھی تھا۔ وہ سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا یہ چاہ رہا تھا کہ تمام ملک کے لوگوں میں ایکتا، بھائی چارے اور خوشحالی کی لہر دوڑ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ تمام لوگ مذہبوں، دھرموں، ذات پات، چھوت چھات اور ریتی رواجوں کو چھوڑ کر انسانیت کے رنگ میں رنگ جائیں کیونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دنیا میں انسان کا خون سب سے زیادہ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر بہایا گیا ہے۔ ایک ہفتے تک جیون داس مسلسل بیقراری محسوس کرتا رہا۔ وہ لاکھوں لوگوں تک اپنے باغیانہ خیالات و نظریات پہنچانے کا کوئی بہتر موقع تلاش کر رہا تھا کہ جہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی تعداد لاکھوں میں ہوتی۔ مٹا اس کے چہرے پر بشارت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں بیوی سے کہا۔

”کول! ساون کی ۲۱ تاریخ کو ہم ملن میلے میں جائیں گے۔ اس میلے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی بھاری تعداد ہوتی ہے۔ کول نے پوچھا یہ میلہ کس خوشی میں منایا جاتا ہے۔“

جیون داس نے جواب دیا۔

”یہ میلہ تین طرح کے عاشقوں کا میلہ ہوتا ہے ایک وہ جن کی نئی نئی شادی ہوئی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہوتی ہے اور تیسرے وہ جو اپنے بہار شباب کے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔“

ساون کی ۲۱ تاریخ کو جیون داس اپنی جیون ساتھی کول کے ساتھ ملن میلے میں چلا گیا۔ میلے میں لاکھوں لوگ موجود تھے عورتیں، مرد، بوڑھے نوجوان اور بچے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سبھی آج ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے مذہبوں، دھرموں، عقیدوں، ذاتوں اور رسموں کو اپنے اپنے گھروں ہی میں چھوڑ آئے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی جن کے چہرے خوشی سے کھل رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اس احساس کی غمازی کر رہے ہوں کہ کب کے پھڑے کہاں آ کے ملے۔ جیون داس نے بیوی سے کہا:

کول! آج میں ان لاکھوں لوگوں تک اپنے ترقی پسند خیالات و نظریات پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم یہ تو جانتی ہو کہ ہمارے ملک میں بسنے والے لوگ مختلف ذاتوں، مذہبوں اور ریتی رواجوں اور مخالف مذہبی نظریات کی بنیاد پر انسانیت کا خون بہاتے ہیں۔ اس لئے آج میں ان کو ایک بہت بڑی بات سناؤں گا تاکہ یہ امن و سلامتی اور ترقی کی زندگی بسر کریں۔“

کول نے کہا:

”خاموش رہے ہم یہاں ملن میلہ دیکھنے آئے ہیں۔“

”نہیں کول! مجھے آج اپنے دل کی بھڑاس نکالنے دو۔ میں عوام کو ایک نیا راستہ دکھانا چاہتا ہوں اور اپنے علم کی روشنی سے ان کی زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرنا چاہتا ہوں۔“

جیون داس نے کول کے منع کرنے کے باوجود لاؤڈ اسپیکر پر تمام لوگوں کو باآواز بلند مخاطب کیا:

”میرے دلش کے لوگو! میرے قریب آؤ، میری بڑی بات سنو میں آج آپ کو انسانیت اور بھائی چارے کا ایک نیا فارمولہ بتانا چاہتا ہوں۔ ہمارا ملک اس فارمولے کے تحت ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا اور ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں جو اکثر خوں ریزیاں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی۔“

جیون داس کی لوگ اُس زوردار آواز ہر ایک کے کان میں پڑی اور تمام فرقوں کے لوگ اس کے قریب آنا شروع ہو گئے۔ سب میں ایک تجسس پیدا ہوا کہ آخر جیون داس آدمیوں کے اس وسیع و عریض جنگل میں کیا پیغام مسرت سنانا چاہتا ہے۔ سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں سب کو انتظار اس بات کا تھا کہ آخر جیون داس کہنا کیا چاہتا ہے۔ تھوڑے وقت کے بعد جیون داس نے کہنا شروع کیا۔

”میرے دلش میں بسنے والے بھائیو، بہنو اور بزرگو! ہم سب انسان ہیں مگر مختلف فرقوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے کوئی مسلمان، کوئی سکھ، کوئی بدھ

اور کوئی جین کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری ذاتوں میں ہم بالکل
سمٹ کے رہ گئے ہیں۔ ان مذہبوں، دھرموں اور ذاتوں کی بنیاد پر
ہم ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم
کرتے ہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو اتنی ہیئت دے رکھی ہے کہ ہمارا
ملک ترقی کے بدلے انتہائی تنزلی کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔ اس لئے
اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن و امان اور خوشحالی
قائم ہو، ہمارا ملک ہر طرح سے ترقی کرے اور ہمیں صحیح زندگی کا
لطف حاصل ہو تو اس کے لئے آپ میری باتوں پہ عمل کیجئے میری
رائے یہ ہے کہ آپ تمام..... مذہبوں، ذاتوں اور رسموں
وروا جوں سے اپنا دامن حیات چھڑا لیجئے۔ آپ کا کوئی بھی دین دھرم
نہ ہونے کوئی ذات ہو بلکہ آپ صرف انسان بن کے رہیں کوئی بھی
مذہبی پابندی نہ ہو، کیونکہ مذہبی جنون ہماری تمام آزادیاں اور
عمیاشیاں ختم کر دیتا ہے۔“

مسلسل بولتے بولتے جب جیون داس کی زبان بالکل خشک ہو گئی تو اس نے
پانی کا گلاس منگوایا اور کھڑے کھڑے غٹ غٹ کر کے پی لیا۔ رتن لعل جو حالیہ اسمبلی انتخاب
میں ہار گیا تھا اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ایک شخص سے آہستہ سے کہا۔

”گلتا ہے سالہ پکا ناسک ہے ہم تو مذہب ہی کے نام پر لوگوں سے
ووٹ حاصل کرتے ہیں اور یہ کہتا ہے دین دھرم ہی چھوڑ دو۔“

جیون داس نے پھر بولنا شروع کیا۔

”میرے دلش کے لوگو! انگریزوں کو دیکھو وہ کس طرح پوری دنیا پر حکومت کر
رہے ہیں اور خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ترقی اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ دین
دھرم اور ذات پات پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان میں حرام حلال کی تمیز ہوتی ہے۔ وہ
تو کیزے مکوڑے، جانور یہاں تک کہ سانپ کو بھی مچھلی کی طرح روٹ کر کے کھا لیتے
ہیں۔ اور پھر ہم ہندوستانیوں کا اپنا کیا ہے؟ ہم نے کوئی ایجادات کی ہیں۔ ہم تو

انگریزوں کے نقال ہیں۔ یہ ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، بجلی، ریل گاڑی، موبائل فون اور کمپیوٹر یہاں تک کہ یہ جوتہ بھاری اور میری پیٹ اور اس کی زیب ہے یہ بھی انگریزوں ہی نے بنائی ہے ورنہ اس سے پہلے تو ہمارے یہاں لنگوٹ ہی پہنا کرتے تھے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہم اپنے بچوں کو چھوٹی ہی عمر میں ہندو، مسلمان اور سکھ بننے کی تربیت دیتے ہیں۔ گویا ہم انہیں انسان بنانے کی بجائے ہندو، مسلمان اور سکھ بنانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بچے کو اسکول میں داخل کرنے کے لئے ایک متعینہ عمر رکھی گئی ہے۔ ووٹ ڈالنے اور شادی کرنے کے لئے عمریں مقرر ہیں۔ لیکن بچے کو ہم اسی وقت سے ہندو، مسلمان اور سکھ بنانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں جب وہ بالکل نابالغ ہوتا ہے۔

جیون داس لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو گیا تو کمال دین نے اپنے قریب بیٹھے شخص سے آہستہ سے کہا ”لگتا ہے یہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔“

جیون داس نے اپنے باغیانہ خیالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ”میرے دیش کے لوگو! آخر تم کب تک ان رسوں، رواجوں اور عقیدوں کے لئے اپنی ترقی اور خوشحالی کے راستے مسدود کرتے رہو گے؟ اس لئے میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ انگریزوں کا طرز زندگی اپنا لو اور خوشحال زندگی جیو کیونکہ انگریزوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تمہاری طرح رسوں رواجوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آزاد اور ترقی یافتہ ہیں۔“

زیردستگ نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے آہستہ سے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے کہا ”لگتا ہے کہ اس سارے کا دماغ خراب ہو گیا ہے تبھی یہ ایسی باتیں کرتا ہے۔“ جیون داس کا بھاشن سننے سننے جب ہندو، مسلمان اور سکھ فرقے کے لوگ تھک گئے تو انہوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لینا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں لوگوں کا مجمع غائب ہو گیا۔ کسی میں بھی جیون داس کے باغیانہ خیالات کا منہ توڑ جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کی خاموشی جیسے یہ ظاہر کر رہی تھی کہ انہیں جیون داس کے تمام باغیانہ نظریات سے کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

جیون داس نے جب دیکھا کہ تمام فرقوں کے لوگ بغیر کسی احتجاج کے اپنے

اپنے گھروں کی طرف جارہے ہیں تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر
میں پنجابی گانے کی کیسٹ فٹ کی اور دو دور تک لاؤڈ اسپیکر پر اس گانے کی آواز گونجنے لگی:
”کھاؤ پیو عیش کرو مٹر و دل پر کسے داد کھائیو نہیں“

اب جیون داس اس گانے کی دھن پر چند نوجوانوں کے ساتھ ناچ رہا تھا اور کچھ
ہی لہجوں بعد اس کی بیوی کو مل بھی ناچنے لگی۔



فتنہ

مولوی نعیم الدین تین سال سے چوراہے والی مسجد کے امام تھے۔ عمر اٹھائیس سال کی رہی ہوگی۔ جوانی کا جو بن ان پر سوار تھا۔ گورے چہرے پہ سیاہ مٹھی بھر داڑھی، سفید کرتہ، پانچجامہ اور اوپر سے کالی واسکٹ پہنے، گلے میں سفید اور لال رنگ کی دھاریوں والا ملل کا بڑا رومال، چال ڈھال میں ایک خاص قسم کا طمطراق یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ شرافت اور وضعدار شخصیت کے مالک ہیں۔ حال ہی میں مولویت اور علم قرأت کی سند حاصل کی تھی۔ بہترین مقرر بھی تھے۔ ابھی کنوارے تھے۔ جسم تو جوان تھا ہی دل بھی جوان تھا۔ اسی لئے کبھی کبھی ان کے دل کا پرندہ کالی پہاڑیوں کی طرف اڑان بھرنے کو پھیلتا مگر فوراً ان کے دل و دماغ میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی عظمت اور قبر کی تاریکی میں گناہوں کی سزا کا خیال پیدا ہوتا تو ان کے دل کا پرندہ پھڑپھڑا کے رہ جاتا۔ چار منزلہ چوراہے والی مسجد شہر کے وسط میں اپنی ایک الگ نوعیت کی مسجد تھی۔ مسجد کا گنبد اور اس کے مینار انتہائی دلکش تھے۔ چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ اعلان حق کی صدا میں پانچوں وقت دور دور تک گونجتی تھیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ نمازی جوق در جوق مسجد کی طرف آرہے تھے۔ مسجد کی پہلی منزل تقریباً بھر گئی تھی اور لوگ اب دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے کہ مولوی نعیم الدین صفیں بچھلا گتے ہوئے منبر پر مانگ لے کر چڑھ بیٹھے۔ انہوں نے پہلے تو چند قرآنی آیات تلاوت فرمائیں اور اس کے بعد آثار قیامت کی طرف آئے۔ ان کے پر جوش لب و لہجہ میں طنز و مزہ کے نشتر شامل تھے۔ وہ کفر و شرک، بدعات اور عصر حاضر میں انسانی اقتدار کے فقدان اور ان تمام خرافات کو ایک ایک کر کے بیان کر رہے تھے کہ ان کے باعث حیوانیت اپنا ننگا ناچ دکھا رہی ہے۔ تمام نمازیوں کی نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

ابھی دن کے دو بجنے میں پانچ منٹ کم تھے کہ مولوی نعیم الدین نے دنیا میں بسنے والوں کے لئے دعائے خیر کی اور پورے دو بجے جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب مولوی نعیم الدین زبانی خطبہ پڑھ رہے تھے اور تمام نمازی بڑی عظمت کے ساتھ سر جھکائے خطبہ سن رہے تھے۔ وہ جونہی خطبے سے فارغ ہوئے تو سب نمازی صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ چوراہے والی مسجد کی چاروں منزلیں نمازیوں سے کچھ کھج بھری ہوئی تھیں۔ امام نے تکبیر اولیٰ کہی تو تمام مقتدیوں نے دونوں ہاتھ کانوں کی لوٹک اٹھائے اور ہاتھ باندھ کے قیام میں مولوی نعیم الدین کی دگلداز قرأت کو کلام الہی کی عظمت کے ساتھ سننے لگے۔ پہلی رکعت کے بعد سورہ رحمن پڑھنے لگے تو ان کے رنگین موبائل پر یہ گانا بجنے لگا:

جیون میں پیا تیرا ساتھ رہے

ہاتھوں میں تیرے میرا ہاتھ رہے

وہ زور زور سے سورہ رحمن کی آیات پڑھنے لگے تاکہ موبائل پہ گانے کی آواز کسی سنائی نہ دے اور نماز میں خلل نہ پڑے مگر چھوٹی مائیک ان کی واسکٹ کی اوپر والی جیب کے ساتھ لگی ہوئی تھی جس کے ذریعے چوراہے والی مسجد کی چوتھی منزل سے باہر بھی ان کی قرأت کے ساتھ ساتھ گانے کی آواز گونج رہی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد موبائل پہ گانا بجنے لگتا۔ اب اگر وہ پہلی یا دوسری فرصت میں جیب میں سے موبائل باہر نکال کر اس کا سوئچ آف کرتے تو نماز فاسق ہو جاتی۔ نماز کے تمام مسائل سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انہیں اپنا وجود اس حال میں زمین میں دھنسا ہوا معلوم ہوا۔ پسینے پہ پسینے چھونے لگے۔ خدا خدا کر کے وہ جونہی التحیات میں بیٹھے تو موبائل پہ گانا بند ہوا۔ انہوں نے سلام پھیری تو پیچھے کچھ مقتدی آگ بگولہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی نعیم الدین کی ہڈی پلپی ایک کرنے کے لئے آگے بڑھے کہ اتنے میں کچھ نمازی جن کے بچے مولوی صاحب کے پاس قرآن شریف پڑھنے آتے تھے مولوی صاحب کو تحفظ دینے کے لئے آگے آئے۔ ان میں سے ایک نے دانت کچکا جاتے ہوئے کہا:

”جس نے ماں کا دودھ پیا ہے وہ مولوی صاحب کو ہاتھ لگائے۔“

اتنا کہنا تھا کہ دوا آدمی اس پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے دودھڑوں کے درمیان زبردست تصادم شروع ہوا۔ اب وہ آپس میں لالتوں، مکوں اور امام صاحب کی لالٹھی سے ایک

دوسرے کا حق ادا کرنے لگے۔ مولوی نعیم الدین نے جب لڑائی کا یہ بھیانک منظر دیکھا تو وہ مقتدیوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے بھاگ نکلے اور ایک تنگ و تاریک گلی میں گھس گئے۔ وہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑا مجرم سمجھ کر کہیں پناہ لینے کی تلاش میں دوڑ رہے تھے اور ادھر چوراہے والی مسجد کی پہلی منزل میں نمازیوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، کسی کا بازو اور کسی کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ کسی غلغلو نے جب یہ دیکھا کہ مسئلہ قابو میں آنے والا نہیں تو اس نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں اعلیٰ پولیس آفیسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ چوراہے والی مسجد پر گاڑی لے کر آگیا اور اس نے آتے ہی مسجد کا محاصرہ کیا اور وہ نمازی کہ جن کا خون ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور نہ صرف ایک دوسرے کی ماں بہن کی خبر لے رہے تھے بلکہ گتھم گتھا بھی ہو رہے تھے، گرفتار کر لئے گئے اور جو زنجی تھے انہیں اسپتال میں پہنچایا گیا لیکن مولوی نعیم الدین ڈر و خوف کے مارے چوراہے والی مسجد سے بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ مسلسل دوڑ رہے تھے۔ بالآخر وہ ہانپتے کانپتے ایک پارک میں پہنچ گئے۔ انہیں اپنی بے عزتی کا شدید احساس ہو رہا تھا اور اس گھڑی پہ پچھتا رہے تھے کہ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے موبائل فون کا سوئچ آف کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ مسجد کے گیٹ پر ہی موئے حروف میں یہ تحریر لکھی ہوئی تھی کہ ”مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل بند کر دیجئے“ تین سال میں انہوں نے لوگوں میں جو اعتماد اور عزت و احترام حاصل کیا تھا آج وہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اب انہیں بار بار اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا اور موبائل فون کو وہ زور سے پتھر پر پٹکنا چاہتے تھے۔ انہوں نے غم و غصے کی حالت میں اپنی وائسکٹ کی جیب سے اپنا قیمتی موبائل سیٹ باہر نکالا اور اسے اب پتھر پہ پٹکنے ہی والے تھے کہ دل کے کسی گوشے سے آواز آئی کہ آخر یہ تو دیکھو کہ نماز کے وقت یہ کون خمیٹ مجھے فون کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے موبائل پر نظر کی تو چھ مسڈ کالیں تھیں۔ دیکھا تو یہ سب ان کی منگیتر انہیں فون کر رہی تھی۔ مولوی نعیم الدین کا غصہ فوراً ٹھنڈا پڑ گیا اور موبائل سیٹ واپس پھر جیب میں رکھ دیا مگر اب بھی انہیں یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے چوراہے والی مسجد کے نمازی ابھی ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔



پانچ سال کا بن باس

امان اللہ تقریباً ۲۲ برس سے اپنے پسماندہ گاؤں کو چھوڑ کے شہر میں آئے تھے۔ ان کی ملازمت اور بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ البتہ ان کی زمین اور جھونپڑی نما مکان اب بھی ان کے قبضے میں ہے۔ ان کا تعلق در قبیلہ فہرست ذات سے ہے اور وہ جی پی فنڈ آفس میں ہیڈ کلرک کی پوسٹ پہ تعینات ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں وہ کبھی کبھار چند دنوں کے لئے اپنے آبائی گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ان کے گاؤں کی پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ ادھر نہ تو کوئی گاڑی جاسکتی ہے اور نہ ہی بجلی اور پانی کا کوئی معقول انتظام ہے۔ اوپر کھابڑ راستوں سے گزرنے کے بعد ان کے گاؤں پہنچا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تقریباً ڈیڑھ سو گھرانے کے گاؤں میں موجود ہیں۔

امان اللہ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سب سے بڑی بیٹی کا نام ذلفاں بی بی ہے۔ اس سے چھوٹی کا نام منیرہ بی بی، اس سے چھوٹا بیٹا ہے جس کا نام محمد عاطف ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام عاتقہ بی بی ہے۔ امان اللہ خود ایک شریف النفس اور بے عیب آدمی ہیں۔ ان کی بیوی زرینہ اختر پانچویں جماعت تک پڑھی ہیں مگر ایک باسلیقہ اور نفاست پسند خاتون کی جملہ صفات اس میں موجود ہیں۔ امان اللہ اور ان کی اہلیہ نے اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور ان کے اچھے اخلاق و کردار پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کی بڑی بیٹی ذلفاں بی بی بائیس میں ایم ایس سی ہیں، چھوٹی بیٹی بی ایس سی سال اول میں زیر تعلیم ہے جبکہ بیٹا بارہویں جماعت کا طالب علم ہے اور سب سے چھوٹی نویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ امان اللہ کی بیٹیاں اور بیٹا شہری ماحول میں رہتے ہوئے بہت حد تک

دیہات کے ماحول اور وہاں کے رہن سہن کو ناپسند کرتے ہیں۔

امان اللہ کی سب سے بڑی بیٹی ذلفاں بی بی بائنی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد اب کسی موضوع پر ریسرچ کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ اسی دوران بھارت کی مرکزی سرکار نے دیہاتوں میں تعلیم عام کرنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک نئی تعلیمی پالیسی کو ترتیب دے کر اسے منظوری دی جسے 'عام تعلیمی تحریک' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ امان اللہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی بڑی بیٹی ذلفاں بی بی کا اس سے فارم بھروایا۔ ذلفاں بی بی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اسے اپنے آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول میں بحیثیت معلمہ کام کرنا ہے تو اس نے حیرت و استعجاب کے عالم میں امان اللہ سے پوچھا:

”پاپا میں بائنی میں ایم ایس سی ہوں اور گاؤں کے پرائمری اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی؟ مجھے گاؤں میں نہیں جانا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امان اللہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

”بیٹی! بے شک تم بائنی میں ایم ایس سی ہو مگر تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں بڑی نوکری تو کہاں چھوٹی نوکری بھی نہیں ملتی۔ شہروں میں تعلیم اس قدر عام ہو گئی ہے کہ ہزاروں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بے روزگاری کے دن گزار رہے ہیں۔ تم اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنا کہ اگر تمہاری سلیکشن ہو جائے۔“

ذلفاں بی بی نے اپنے باپ کی نصیحت آمیز باتیں سن کر چپ سادھ لی۔ وہ نہایت حسین، حساس اور محنتی تھی۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے وہ اپنے اکلوتے بھائی اور چھوٹی بہنوں کی پڑھائی، لکھائی اور ان کے اخلاق و کردار کے بارے میں کافی فکر مند رہتی۔ اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد جب ذلفاں بی بی کا نام چیف ایجوکیشن آفیسر کے دفتر میں مرتب کردہ فہرست معلمان میں پہلے نمبر پر آ گیا تو امان اللہ کو اپنی بیٹی کی سلیکشن پہ بے انتہا خوشی ہوئی۔ انہوں نے ذلفاں بی بی کو ساتھ لے کر دفتر سے حکم نامہ حاصل کیا۔ اس کے حکم نامے میں اس کے آبائی

گاؤں کے اسکول کا نام اور ضروری شرائط کے علاوہ اس کی پندرہ سو ماہانہ تنخواہ کا ذکر تھا۔ حکمنامے میں یہ بات بھی درج تھی کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کے تحت ایک معلم یا معلمہ کو پانچ برس کے بعد مستقل طور پر سرکاری ملازمت کے تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے اور دوسرے کے بعد دو ہزار روپے اور پھر تین برس پورے ہونے کے بعد تین ہزار سو روپے تنخواہ ہوگی۔ ذلفاں بی بی کے دل میں خوف اور ذہن میں ایک انجانے دان دیکھے ماحول میں زندگی گزارنے کا تصور بار بار ابھر رہا تھا۔ بائنی میں ایم ایس سی پرائمری اسکول میں درس و تدریس کا کام، پندرہ سو روپے ماہانہ گاؤں کا ماحول، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بہت دور، سرکاری نوکری ملنے کا احساس مگر فی الحال عارضی طور پر صبر آزمائی کا ایک طویل سلسلہ۔ یہ تمام باتیں ذلفاں بی بی کے ذہن و دل میں کچھ کے لگا رہی تھیں مگر اس کے باوجود اس نے اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں ہی اپنے مستقبل کو تباہ بنانے کا عزم کیا اور پھر وہ ایک دن اپنے باپ کے ہمراہ اپنے بھائی، بہنوں اور ماں سے رخصت لے کر گاؤں چلی گئی۔ وہ اپنے باپ کے ہمراہ شہر کی کشادہ اور کچی سڑک پر سے گزرنے والی منی بس میں سوار تھی کہ اچانک بہت دور جانے کے بعد منی بس ایک کچی سڑک پر ہچکولے کھانے لگی۔ سڑک کے آس پاس مختلف قسم کے درختوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد امان اللہ نے گاڑی رکوائی اور دونوں باپ بیٹی منی بس سے نیچے اترے۔ اب انہیں ایک کلومیٹر چڑھائی کا سفر درپیش تھا۔ امان اللہ تو خود بچپن سے اوڑھکھا بڑا راستوں پر چلنے کے عادی تھے مگر ذلفاں بی بی کے لئے یہ چڑھائی ماؤنٹ ایوریسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف تھی۔ آخر کار شام ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ذلفاں بی بی اپنے باپ کے ہمراہ تھک ہار کے اپنے آبائی گاؤں میں پہنچی۔ غفار چودھری گاؤں کے معتبر آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا عبدل مال مویشی چرانے کا کام کرتا تھا اور چھوٹا بیٹا نصیر فوج میں ملازم تھا ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں شادی شدہ تھیں۔ غفار چودھری کے گھر پر امان اللہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ چودھری غفار اور ان کے اہل خانہ امان اللہ اور ان کی بیٹی کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے امان اللہ کو مبارک باد دی۔ کھاٹ پہ نیا کبیل بچھا یا دیسی لسی کا انتظام کیا۔ لائین میں مٹی کا تیل ڈالا۔ گھر کے برآمدے میں پڑے کوڑے کو جھاڑو سے صاف کیا۔

چودھری غفار حقے اپنے منہ سے الگ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذلغاں بی بی کے سر پہ اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے۔

”ہمارے گاؤں کی پتری جوان ہو گئی ہے رب سکھی رکھے! گاؤں میں روشنی بن کر آئی ہے۔ مالک تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے۔ کسی بات کی بٹیا فکر نہ کرنا جو دال پھلکھہ ہمارے گھر میں پکے گا اپنا گھر سمجھ کر کھا لینا۔“

ذلغاں بی بی کو غفار چودھری کی باتیں سن کر تھوڑی سی تسلی ملی۔ اس کے چہرے پر بشارت سی ابھر آئی۔ شب کی سیاہی میں سارا گاؤں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دور تک یہاں وہاں گھروں میں چراغوں کی لومٹنارہی تھی۔ کہاں شہر کی گلیوں اور بازاروں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی اور لوگوں کی چہل پہل اور کہاں یہ گاؤں کا سنسان ویران سا ماحول، ذلغاں بی بی کو اس ماحول میں اپنا آپ اس رنگین پروں والی فاختہ کی مانند معلوم ہو رہا تھا کہ جو اڑان بھرتے بھرتے کسی خاردار جھاڑی میں پھنس گئی ہو۔ انہی خیالوں میں گم کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پہ دراز ہو گئی۔ مگر پریشان کن خیالات اسے بار بار کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ پھر وقفے وقفے کے بعد کہیں دور سے اس کے کانوں میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ دھیرے دھیرے نیند کی پری نے اسے اپنی آغوش میں لے کر بے سدھ کر دیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ غفار چودھری کی بیوی اور اس کی بڑی بہو بھینسوں سے دودھ لے رہی ہیں۔ امان اللہ نے ذلغاں بی بی کو کہا:

”بیٹی تیار ہو جاؤ آج اسکول میں تمہاری جوائننگ ہے۔“

دونوں باپ بیٹی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسکول چلے گئے۔ پرائمری اسکول گاؤں کے وسط میں تھا۔ اس میں بھوشن لال نام کا ایک استاد تعینات تھا۔ اسکول کے حاضری رجسٹر میں کل پچاس بچوں کے نام درج تھے۔ لیکن اسکول میں اس روز پندرہ ہی بچے آئے تھے۔ ذلغاں بی بی نے اپنی جوائننگ رپورٹ لکھی اس کے ساتھ اپنی آرڈر کا پی لگائی اور بھوشن لال کو پکڑائی۔ اسکول کی عمارت دو کمروں پہ مشتمل تھی۔ دو کرسیاں صحیح حالت

گاؤں کے اسکول کا نام اور ضروری شرائط کے علاوہ اس کی پندرہ سو ماہانہ تنخواہ کا ذکر تھا۔ حکمنامے میں یہ بات بھی درج تھی کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کے تحت ایک معلم یا معلمہ کو پانچ برس کے بعد مستقل طور پر سرکاری ملازمت کے تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے اور دو برس کے بعد دو ہزار روپے اور پھر تین برس پورے ہونے کے بعد تین ہزار سو روپے تنخواہ ہوگی۔ ذلفاں بی بی کے دل میں خوف اور ذہن میں ایک انجانے وان دیکھے ماحول میں زندگی گزارنے کا تصور بار بار ابھر رہا تھا۔ بائنی میں ایم ایس سی پرائمری اسکول میں درس و تدریس کا کام، پندرہ سو روپے ماہانہ گاؤں کا ماحول، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بہت دور، سرکاری نوکری ملنے کا احساس مگر فی الحال عارضی طور پر صبر آزمائی کا ایک طویل سلسلہ۔ یہ تمام باتیں ذلفاں بی بی کے ذہن و دل میں کچھ کے لگا رہی تھیں مگر اس کے باوجود اس نے اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں ہی اپنے مستقبل کو تباہ بنا کر عزم کیا اور پھر وہ ایک دن اپنے باپ کے ہمراہ اپنے بھائی، بہنوں اور ماں سے رخصت لے کر گاؤں چلی گئی۔ وہ اپنے باپ کے ہمراہ شہر کی کشادہ اور کچی سڑک پر سے گزرنے والی مٹی بس میں سوار تھی کہ اچانک بہت دور جانے کے بعد مٹی بس ایک کچی سڑک پر بچکولے کھانے لگی۔ سڑک کے آس پاس مختلف قسم کے درختوں کا لاتنا ہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد اماں اللہ نے گاڑی رکوائی اور دونوں باپ بیٹی مٹی بس سے نیچے اترے۔ اب انہیں ایک کلومیٹر چڑھائی کا سفر درپیش تھا۔ اماں اللہ تو خود بچپن سے اوڑھ کھابڑ راستوں پر چلنے کے عادی تھے مگر ذلفاں بی بی کے لئے یہ چڑھائی ماؤنٹ ایوریسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف تھی۔ آخر کار شام ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ذلفاں بی بی اپنے باپ کے ہمراہ تھک ہار کے اپنے آبائی گاؤں میں پہنچی۔ غفار چودھری گاؤں کے معتبر آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا عبدل مال سولہی چرانے کا کام کرتا تھا اور چھوٹا بیٹا نصیر فوج میں ملازم تھا ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں شادی شدہ تھیں۔ غفار چودھری کے گھر پر اماں اللہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ چودھری غفار اور ان کے اہل خانہ اماں اللہ اور ان کی بیٹی کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اماں اللہ کو مبارک باد دی۔ کھاٹ پہ نیا کپل بچھا یا دیسی لسی کا انتظام کیا۔ لالٹین میں مٹی کا تیل ڈالا۔ گھر کے برآمدے میں پڑے کوڑے کو جھاڑو سے صاف کیا۔

چودھری غفار حقے اپنے منہ سے الگ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذلفاں بی بی کے سر پہ اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے۔

”ہمارے گاؤں کی پتری جوان ہو گئی ہے رب سکھی رکھے! گاؤں میں روشنی بن کر آئی ہے۔ مالک تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے۔ کسی بات کی بٹیا فکرنہ کرنا جو دال پھسلے ہمارے گھر میں بچے گا اپنا گھر سمجھ کر کھالینا۔“

ذلفاں بی بی کو غفار چودھری کی باتیں سن کر تھوڑی سی تسلی ملی۔ اس کے چہرے پر بناشت سی ابھڑ آئی۔ شب کی سیاہی میں سارا گاؤں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دور تک یہاں وہاں گھروں میں چراغوں کی لوٹٹمار ہی تھی۔ کہاں شہر کی گلیوں اور بازاروں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی اور لوگوں کی چہل پہل اور کہاں یہ گاؤں کا سنان ویران سا ماحول، ذلفاں بی بی کو اس ماحول میں اپنا آپ اس رنگین پروں والی فاختہ کی مانند معلوم ہو رہا تھا کہ جو اڑان بھرتے بھرتے کسی خاردار جھاڑی میں پھنس گئی ہو۔ انہی خیالوں میں گم کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پہ دراز ہو گئی۔ مگر پریشان کن خیالات اسے بار بار کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ پھر وقفے وقفے کے بعد کہیں دور سے اس کے کانوں میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ دھیرے دھیرے نیند کی پری نے اسے اپنی آغوش میں لے کر بے سدھ کر دیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ غفار چودھری کی بیوی اور اس کی بڑی بہو بھینسوں سے دودھ لے رہی ہیں۔ امان اللہ نے ذلفاں بی بی کو کہا:

”بیٹی تیار ہو جاؤ آج اسکول میں تمہاری جوائننگ ہے۔“

دونوں باپ بیٹی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسکول چلے گئے۔ پرائمری اسکول گاؤں کے وسط میں تھا۔ اس میں بھوشن لال نام کا ایک استاد تعینات تھا۔ اسکول کے حاضری رجسٹر میں کل پچاس بچوں کے نام درج تھے۔ لیکن اسکول میں اس روز پندرہ ہی بچے آئے تھے۔ ذلفاں بی بی نے اپنی جوائننگ رپورٹ لکھی اس کے ساتھ اپنی آرڈر کا پی لگائی اور بھوشن لال کو پکڑائی۔ اسکول کی عمارت دو کمروں پہ مشتمل تھی۔ دو کرسیاں صحیح حالت

میں تھیں اور دوختہ تھیں۔ بچے بغیر وردی کے یوں لگ رہے تھے کہ جیسے کسی پھلدار پیڑ کو پتھر مارنے آئے ہوں۔ اسکول میں گھنٹی کے بدلے لوہے کا ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا جسے اسکول کھولنے بند کرنے اور آدھی چھٹی کے وقت بجایا جاتا تھا۔ ذلّاقاں بی بی اسکول اور بچوں کی خستہ حالت دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ اس کی زبان سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ آج اسے عملی طور پر شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن امان اللہ نے غفار چودھری سے رخصت لیتے ہوئے کہا:

”میری بیٹی! پہلے تو خدا کے حوالے پھر آپ کے حوالے۔ اس کا خاص خیال رکھیے گا۔ شہری ماحول سے نکل کر دیہاتی ماحول میں آئی ہے۔ فی الحال پریشان سی لگ رہی ہے۔“

غفار چودھری بولے

”آپ بیٹی کی فکر نہ کیجئے ہم اس کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ یہاں اس کو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے گھر میں سمجھ لے۔“

امان اللہ نے اپنی بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

”بیٹی خوش رہنا اپنے کام کو عبادت سمجھ کر انجام دینا جب ہمارے لئے اداس ہو جاؤ گی تو شہر چلے آنا۔ ہمت و حوصلے سے کام لینا۔ یہ لو چار ہزار روپے اپنے پاس رکھ لو۔ میری یہ بات یاد رکھنا کہ نیک نیتی، بلند ہمتی اور محنت و لگن سے کام کرنے والے لوگ دنیا میں عزت اور کامیابی والی زندگی گزارتے ہیں۔“

ذلّاقاں بی بی اپنے باپ کی باتیں سن کر باوجود ضبط کے اپنے آنسوؤں کو نہ روک پائی۔ دو بوند آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ باپ کے شہر جانے کے بعد ذلّاقاں بی بی نے اپنے آپ میں ہمت و حوصلہ پیدا کیا۔ وہ دل میں یہ عزم لے کر اٹھی کہ وہ ان پانچ برسوں میں اپنے بل بوتے پر ایک خوشگوار انقلاب برپا کرے گی۔ خاص کر اپنے گاؤں کی پسماندگی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ صفائی، سچائی اور پاکیزہ اخلاق و کردار کی

تعلیم پر خصوصی توجہ دے گی۔ اس نے سمجھتے ہوئے غفار چودھری سے کہا:
 ”چچا! میں آپ کے مکان میں ایک الگ کمرے میں اپنی کتابیں،
 بستر اور دوسری ضروری چیزیں رکھنا چاہتی ہوں تاکہ میں اسکول میں
 ڈیوٹی دینے کے بعد اپنی کتابیں پڑھ سکوں۔“
 ”جی! اچھی بات ہے تم اس پچھلے کمرے میں اپنا بستر، کتابیں اور
 پہننے کے کپڑے رکھ سکتی ہو۔“

انہوں نے خود جا کر ذلفاں بی بی کو کمرہ دکھایا۔ ذلفاں بی بی نے خود جھاڑو سے
 کمرے میں صفائی کی۔ چار پائی ایک طرف لگائی، بستر پہ نیا بیڈ شیٹ ڈالا، ردی اخباروں کو
 دیواروں پہ چسپاں کیا اور اس طرح پورا کمرہ بیٹھنے کے لائق بنا دیا۔ موسم تہوں کا پیکٹ وہ
 دکان سے خرید لائی تاکہ رات کو موسم بتی جلا کر لکھنے پڑھنے کا کام کر سکے۔ رات کو کھانا کھانے
 کے بعد ذلفاں بی بی نے علم نباتات کی کتابوں کے علاوہ سماجیات، اقتصادیات، دینیات
 اور دنیا کی عظیم شخصیات سے متعلق کتابیں نکلڑی کی الماری میں ترتیب سے رکھیں۔ سونے
 سے پہلے غفار چودھری کی بہو نے اسے دودھ کلا گلاس دیا پھر اس نے اپنا موبائل سیٹ آن
 کیا گھر میں سب سے فون پہ باتیں کرنے کے بعد موبائل فون کا سوچ آف کر کے سو گئی۔
 صبح وہ جلدی جا گئی۔ نماز اور تلاوت کلام پاک کے بعد چائے ناشتے سے فارغ ہوئی۔
 قرمزی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا اور اسکول چلی گئی۔ بیس منٹ کم دس پہ وہ اسکول پہنچی۔
 ابھی کچھ ہی بچے اسکول میں آئے تھے۔ بھوشن لال دس بج کر دس منٹ پہ اسکول پہنچا بچوں
 کو ایک چھوٹے سے گراؤنڈ میں پرارتھنا کرنے کے لئے قطاروں میں کھڑا کیا گیا۔ پانچویں
 کی دولڑکیاں سامنے آکھڑی ہوئیں اور پرارتھنا شروع کی۔ ذلفاں بی بی کو یوں محسوس ہوا کہ
 بچے پرارتھنا نہیں کر رہے بلکہ بے شری آواز میں آہ وزاری کر رہے ہیں۔ پرارتھنا کے بعد
 بچوں کو اپنی کلاسوں میں جانے کو کہا گیا۔ تمام بچے بھگدڑ مچاتے ہوئے چلے گئے۔ آخر میں
 بھوشن لال اور ذلفاں بی بی اسکول کے آفس میں چلے گئے۔ بھوشن لال کافی سینئر لیچر تھے
 محکمہ تعلیم میں وہ بیس برس سے کام کر رہے تھے۔ ذلفاں بی بی نے بڑے پر اعتماد لہجے میں
 بھوشن لال سے کہا۔

”سر! ہمیں اپنے اسکول کو مثالی اسکول بنانے کے لئے کامیاب منصوبہ بندی کے تحت ٹھوس اقدامات اٹھانے پڑیں گے۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کا بھرپور تعاون چاہیئے۔“

بھوشن لال نے کہا
 ”میں تو آپ کا ساتھ دوں گا لیکن آپ نے یہ مشہور ضرب المثل ضرور سنی ہوگی کہ ”جیسا دیس ویسا بھیس“ یہ گاؤں کا پرائمری اسکول ہے اسے کیا مثالی اسکول بناؤ گی ذلفاں بی بی؟“
 ذلفاں بی بی نے جواب دیا۔

”سر! انسان کو نیک نیتی سے کام کرنا چاہیئے۔ میں دیس اور بھیس میں بدلاؤ چاہتی ہوں، لہذا ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم اپنی استعداد کے مطابق کوشش تو کریں۔“

بھوشن لال نے کوئی بھی دلیل نہیں دینا چاہی۔ خاموش رہے پھر آہستہ سے کہا
 ”چلئے آپ بدلاؤ کی مہم شروع کر کے دیکھ لیں۔“

ذلفاں بی بی نے سب سے پہلے اسکول کا نام ٹیبل بدلا۔ پانچویں اور چوتھی کلاس کے تمام مضامین اپنے نام پر رکھتے ہوئے بھوشن لال کو پہلی سے تیسری تک کی کلاسیں پڑھانے کو دیں۔ بچوں کو چھٹی ہونے سے پہلے اسکول کے احاطے میں بٹھایا۔ انہیں اسکول کی وردی کی اہمیت سمجھائی۔ نیلے رنگ کی پتلون اور سفید رنگ کی قمیص سلوانے کو کہا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو وردی تیار کروانے کی ہدایت دی۔ دوسرے دن اس نے بھوشن لال کو یہ مشورہ دیا۔

”سر میں چاہتی ہوں کہ سرینچ صاحب اور اس گاؤں کے اسکول کمیٹی ممبران کو بذریعہ نوٹس کل یہاں مدعو کیا جائے تاکہ ان کی موجودگی میں ہم اس اسکول کو منڈل اسکول بنانے، گاؤں میں بجلی، پانی اور سڑک کا معقول انتظام کرنے کا تحریری طور پر منصوبہ تیار کر کے انہیں حکام اعلیٰ کے پاس بھیجیں۔“

بھوشن لال متفق ہوئے۔ انہوں نے کہا ”ہاں کل یہی کام کریں گے تمہارا مشورہ اچھا ہے۔“

دوسرے دن ذلعاں بی بی اور بھوشن لال نے سرینچ اور اسکول کمیٹی ممبران کے نام دعوتی رقعے لکھ کر بچوں کے ہاتھ ان تک پہنچانے کو دیے۔ سرینچ اور ممبران کمیٹی جب اسکول میں آئے تو ذلعاں بی بی نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

”ہم آپ کے مشکور و ممنون ہیں کہ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر یہاں تشریف فرما ہوئے۔ میں اسکول اور پورے گاؤں کے بارے میں آپ کے سامنے چند اہم اور بنیادی مسائل رکھنا چاہتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آج کی اس میٹنگ میں ہم سب جو فیصلہ لیں گے اسے عملی جامہ پہنانے کی خاطر آپ ہر طرح کی قربانی دیں گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس پرائمری اسکول کو مڈل اسکول بنانا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پورے گاؤں میں بجلی نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ ہمارا اسکول اور گاؤں وائر سپلائی اسکیم سے محروم ہے۔ چوتھی بات یہ کہ اسکول کی عمارت بچوں کے لئے ناکافی ہے۔ پانچویں بات یہ کہ پردھان منتری گرام سڑک یोजना کے تحت ہمارا گاؤں نہیں لایا گیا ہے۔ یہ وہ اہم اور بنیادی مسائل ہیں جن کو حل کرنے کے لئے ہم سب کو جدوجہد کرنی پڑے گی۔ آپ نے یہ ضرور سنا ہوگا کہ ’بن روئے ماں بچے کو دودھ نہیں دیتی‘ آپ کو میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ حکومت وقت کے اعلیٰ افسران یعنی پانی، سڑک، بجلی اور تعلیم کے وزیر تک رسائی حاصل کریں اور تحریری صورت میں انہیں اپنے مطالبات پیش کریں گے تو انہیں منظوری مل جائے گی۔“

گاؤں کے سرینچ اور دوسرے ممبران اسکول کمیٹی نے ذلعاں بی بی کی تعمیراتی سوچ اور اس کی باتیں سن کر نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ سب نے بیک آواز افسران اعلیٰ سے اپنے مطالبات کو پورا کروانے کا مصمم ارادہ بھی کیا۔ ذلعاں بی بی نے بجلی، پانی، سڑک

اور تعلیم کے وزیر کے نام الگ الگ درخواستیں لکھیں ان پر سرینچ، ممبران اسکول کمیٹی اور گاؤں کے بہت سے لوگوں کے دستخط کروائے اور سرینچ کو یہ تمام درخواستیں سونپیں۔ میٹنگ برخواست ہونے کے بعد بھوشن لال اپنے گھر گئے اور ذلفاں بی بی اپنے ڈیرے پر چلی آئی۔ اس نے کھانا کھایا۔ نماز عصر پڑھی اور تسبیح لے کر بستر پر لیٹے لیٹے اللہ کا ذکر کرنے لگی۔ دوسرے دن جب وہ بروقت اسکول پہنچی تو اس نے سب سے پہلے بچوں کو گراؤنڈ میں قطاروں میں کھڑا کیا۔ انہیں پرارتھا کروانے کے بعد نیچے بیٹھنے کو کہا۔ پھر اس نے انہیں صحت، صفائی اور نظم و ضبط کے بارے میں لیکچر دیا۔ اس کے بعد کلاسوں میں بھیج دیا۔ جب وہ آفس میں آئی تو اس نے بھوشن لال کو کہا:

”سر! ہمارے اسکول میں گھنٹی نہیں ہے جب بچے لوہے کا ڈنڈا بجاتے ہیں تو میں ڈرجاتی ہوں۔ میں اگلے ہفتے اپنے والدین کے پاس شہر جا رہی ہوں میں اسکول کے لئے اچھی سی گھنٹی خرید لاؤں گی۔ دوسری بات یہ کہ آپ مجھے اسکول فنڈ پوزیشن دکھائیے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری کیش بکس میں کتنا روپیہ ہے۔“

بھوشن لال کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ٹرنک سے تمام کیش بکس نکال کر ذلفاں بی بی کے سامنے رکھیں اور اسے کہنے لگے۔

”ان کیش بکوں میں کیش ان بینڈ اور کیش ان بینک کی تفصیل ایک الگ کاغذ پر نوٹ کریں، ویسے میں نے ان کیش بکوں کو بڑی حفاظت میں رکھا ہے اور بچوں کا یہ پیسہ خرچ کرنا میں گناہ خیال کرتا ہوں۔“

ذلفاں بی بی کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکان ابھر آئی وہ بولی

”سر گھنٹی بلڈنگ فنڈ سے خریدی جائے گی۔ اس لئے میں سب سے پہلے بلڈنگ فنڈ والی کیش بک چیک کرتی ہوں۔“

بھوشن لال نے کہا ”ہاں ٹھیک ہے۔“

ذلفاں بی بی نے بلڈنگ فنڈ والی کیش بک میں تاحال دس ہزار روپے کیش ان

بینک دیکھا اور کیش ان ہینڈ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے غریب فنڈ کیش بک پر نظر دوڑائی تو اس میں سات ہزار روپے کیش ان بینک پایا۔ اسی طرح پرنٹنگ فنڈ میں چھ ہزار روپے اور کھیلوں والی کیش بک میں آٹھ ہزار روپے کیش ان بینک تھا۔ پاس بکوں میں بھی اسی طرح کا اندراج تھا۔ غرض کہ کل ملا کر تمام کیش بکوں میں تقریباً تیس ہزار روپے تھا جو بینک میں جمع تھا۔ ذلفاں بی بی یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی پھر اس نے بھوشن لال کو بھھاؤ دینا چاہا اس نے کہا:

”سر! اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان تمام کیش بکوں کا چارج آپ مجھے دے دیجئے میں ان کیش بکوں میں جمع شدہ رقم ایک ضابطے کے تحت بچوں اور اسکول پر خرچ کروں گی۔“

بھوشن لال خوش ہوئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتار رہا ہو۔ انہوں نے ذلفاں بی بی کو کہا:

”ہاں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ تمام کیش بکس اگر آپ کے چارج میں رہیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

ذلفاں بی بی نے کہا:

”سر میں چاہتی ہوں کہ اسکول آفس کو بیٹھنے کے لائق بنایا جائے۔ میں چونکہ تین دن کے بعد اپنے والدین کے پاس شہر جا رہی ہوں اس لئے چند اہم چیزوں کی فہرست بناؤں گی اور آپ مجھے فی الحال چار ہزار روپے کا چیک بلڈنگ فنڈ میں سے کاٹ کر دیجئے۔“ بھوشن لال نے چیک کاٹ کر دے دیا۔

ذلفاں بی بی نے بھوشن لال کا شکریہ ادا کیا اور پانچویں کلاس میں بچوں کو پڑھانے چلی گئی۔ بچے شور کر رہے تھے۔ وہ جونہی کلاس میں پہنچی تو بچے چپ ہو گئے۔ اس نے انہیں سب سے پہلے انگریزی پڑھائی، پھر حساب پڑھایا۔ انہیں گھر کیلئے کام کرنے کو دیا۔ اس کے بعد اس نے چوتھی کلاس کے بچوں کو سائنس اور سوشل سائنس پڑھائی۔ انہیں بھی گھر کے لئے کام دیا۔ ریس کے دوران اس نے پانچویں کلاس کی چار لڑکیوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں یہ پرارتھنا لکھ کر دی:

اے مالک تیرے بندے ہم ایسے ہوں ہمارے کرم
نیکی پر چلیں اور بدی سے نلیں تاکہ ہنتے ہوئے نکلے دم

ذلفاں بی بی نے سترم آواز میں لڑکیوں کو پرارتھنا سکھانے کی ریہرسل کرائی
اور آنے والے لکل بھی پرارتھنا کرنے کو کہا۔ چار بجے کے بعد ذلفاں بی بی اپنے ڈیرے پہ
آئی تو اس نے اسکول آفس کمرے کو سجانے اور اس میں ضروری اشیا کی فہرست تیار کی جس
میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرسی کے اوپر رکھا جانے والا تولیہ، ہاتھ دھونے والا صابن، بڑے
سائز کا آئینہ جو چہرہ دیکھنے کے لئے دیوار کے ساتھ آویزاں ہو، وال کلاک، چھ شیشے کے
گلاس، درمیانہ سائز کی پیس کی گھنٹی، دو اچھی سی کرسیاں اور ہندوستان کے مجاہدین آزادی
کی تصاویر شامل تھیں۔ شام کے ملجی سائے پھیلنے لگے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے
وضو بنایا اور نماز مغرب ادا کی۔ برسات کی بھیگی رات تھی جس کی وجہ سے اس پہ غنودگی طاری
ہو رہی تھی۔ مگر اس کے کمرے میں مجھروں نے اس کے کانوں کے قریب آکر اپنا راگ
الاینا شروع کر دیا۔ وہ دیر تک اپنے مخلص وجود پہ یہاں وہاں ہاتھ مارتی رہی کہ اتنے
میں غفار چودھری کی بیوی نے اسے کھانا کھانے کو کہا وہ انھی اور کھانا کھانے چلی گئی۔ کھانا
کھانے کے بعد جب وہ غفار چودھری کی آٹھ سالہ پوتی کے ساتھ مکان سے باہر آئی تو اس
نے آسمان پہ چمکتے چاند کو دیکھ کے مسرت اور روحانی آسودگی محسوس کی۔ تب اس کے ذہن
میں یہ خیال آیا کہ روشنی چاند کی ہو یا سورج کی اندھیرے کی دشمن ہوتی ہے۔ اسی طرح
جس طرح سچ جھوٹ کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچ کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی
کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ دنیا کے تمام مذاہب، عقیدے، دھرم، فکر و فلسفے، پیغمبر،
ادوار، رشی منی، صوفی سنتوں کی تعلیم، تمام علوم و فنون اور دانش گاہوں کا بنیادی مقصد یہ ہے
کہ آدمی کو اس دنیا میں انسان بنایا جائے۔ اس میں چھپے کام، کرودھ، موبھ، لوبھ اور اہنکار
کو ختم کیا جائے۔ پھر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو یہ دیکھ کے حیران رہ گئی کہ بی بی نے
جو ہے کو اپنے دانتوں تلے دبا رکھا ہے اور چوہا اُس سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔
ذلفاں بی بی کو دیکھتے ہی بی بی چوہے کو لے کر الماری کے پیچھے چلی گئی اور آہستہ آہستہ غرانے
لگی۔ لمحہ بھر کے بعد بی بی نے چوہے کو اپنے نوکیلے دانتوں کی گرفت سے آزاد کیا۔ چوہا زمین

پر سر کئے لگا۔ پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو بلی فوراً اس پہ چھٹ پڑی۔ بلی چوہے کا یہ
 کھیل وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر جب وہ بستر پہ آئی تو چوہے کی دلدوز چیخیں اسے سنائی
 دیں۔ وہ سمجھ گئی کہ ایک جانداز زندہ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ معا سے اپنی کتابوں کی طرف
 دھیان گیا وہ بستر سے اٹھی اور کمری کی الماری میں ترتیب سے رکھی کتابوں کو الٹ پلٹ کر
 دیکھنے لگی کہ کہیں چوہوں نے انہیں کترنا شروع نہ کیا ہو۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کتابیں
 محفوظ تھیں تب اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بلی ایک فائدہ مند جانور ہے اور چوہا نقصان
 کرنے والا۔ وہ دوبارہ بستر پہ دراز ہو گئی۔ مگر ماں باپ اور بھائی بہنوں کی یاد نے اسے
 کروٹیں بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اسے دل ہی دل میں یہ خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ کل وہ شہر اپنے
 ماں باپ اور بھائی بہنوں کے پاس چلی جائے گی۔ اسی خوشی میں اس کی آنکھوں میں نیند اتر
 آئی اور وہ خوابوں کی دنیا میں چلی گئی۔ دوسرے دن وہ صبح جلدی جاگی اور غفار چودھری کی
 بہو کو ساتھ لے کر ایک باؤلی پہ نہانے چلی گئی۔ نہانے کے بعد اس نے نماز فجر پڑھی۔ اس
 کے بعد دعائے گنج العرش پڑھنے بیٹھ گئی۔ خدا سے کل عالم میں بسنے والوں کے لئے امن
 و سلامتی اور ہدایت کی دعا کی۔ پھر وہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسکول کے لئے تیار
 ہو گئی۔ اسکول میں وہ صرف ایک گھنٹہ رہی اور پھر اس نے بھوشن لال کو کہا:

”اچھا سر! میں اب گھر جا رہی ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد
 آؤں گی۔ میں نے اسکول آفس کے لئے ضروری چیزوں کی فہرست
 تیار کی ہے میں وہ تمام چیزیں نیچے سڑک کے کنارے دکان پہ
 رکھوں گی اور کسی مزدور کو مزدوری دے کر یہاں پہنچاؤں گی۔“
 بھوشن لال نے کہا:

”جائیے میری طرف سے اجازت ہے۔“

ذلفاں بی بی جب ڈیرے پہ آئی تو غفار چودھری کی بیوی نے اس کے گھر
 والوں کے لئے ٹماٹر، بھنڈی، کھیرے اور لیٹن ایک تھیلے میں ڈال رکھے تھے۔ وہ خوش ہو گئی
 پھر جب وہ غفار چودھری اور اس کی بیوی سے رخصت لینے لگی تو غفار چودھری نے کہا
 ”بیٹی ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، تمہیں گاڑی پہ بٹھا

آؤں گا۔“

ذلفاں بی بی غفار چودھری کے ہمراہ اپنے گاؤں سے نیچے سڑک پہ آئی۔ اس نے اپنا سوبائل فون دکان پہ چار جنگ پہ لگایا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے دور سے شہر جانے والی مٹی بس نظر آئی۔ غفار چودھری نے ہاتھ دکھا کر مٹی بس رکوائی اور ذلفاں بی بی اس پہ سوار ہو گئی۔ تین گھنٹے کے بعد وہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے پاس چلی گئی۔ اس نے سب سے پہلے ماں کو سلام کیا، اسے گلے لگایا پھر باپ کے پاس گئی اس سے دعائیں لیں اپنے بھائی بہنوں کی خیریت دریافت کی، خوشی اور اطمینان سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ دوسرے دن جب وہ بازار میں ایک جگہ اپنی سہیلیوں سے ملی تو ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا:

”کب کی بچھڑی کہاں آ کے ملی۔“

ذلفاں بی بی نے جواب دیا ”میں رو پڑتی ہوں جب گزرا زمانہ یاد آتا ہے“
ذلفاں بی بی کی تینوں سہیلیوں نے ہنستے ہوئے کہا:

”واہ! اری تو تو شاعرہ بن گئی ہے۔“

”شاعری نہیں کر رہی ہوں سچ کہتی ہوں وقت اور مسائل حیات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ گردش روز و شب نے ہم سے ہمارا بچپن اور لڑکپن چھین لیا ہے میری سہیلیو جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔“

ذلفاں بی بی کی ایک اور سہیلی نے اسے کہا ”یار فلا سفی تیرا سبکیٹ تو رہا نہیں ہے لیکن تیری ہر بات فلسفیانہ ہوتی ہے۔“

ذلفاں بی بی بولی ”اچھا چھوڑ دو یہ باتیں آؤ میں تمہیں گول گفے کھلاتی ہوں مجھے گول گفے بہت پسند ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کالج کے باہر گیٹ کے ایک طرف ہم اکثر کالج سے نکلنے کے بعد گول گفے کھایا کرتی تھیں۔“

چاروں گول گفے کھانے لگیں۔ گول گفے والے نے مرچ تھوڑی تیز رکھی تھی۔ وہ عموماً کرتی رہیں۔ پیسے دینے کی باری آئی تو ذلفاں بی بی نے پہل کی پھر وہ اپنی سہیلیوں کو کسی شاعر کا یہ شعر سناتی ہوئی ان سے رخصت ہونے لگی۔

میری زندگی کا حاصل کہ سب کو فیض پہنچے
میں چراغِ راہ گزر رہوں مجھے شوق سے جلانا

اس کی سہیلیوں کو شعر بہت پسند آیا تو ان میں سے ایک نے کہا ”بہت خوب! جیتی رہو“ اچھا وہ کے تھینک پو“ اور وہ ان سے رخصت ہو گئی۔ تین دن کے بعد ذلّٰف بی بی نے اپنے اسکول آفس کے لئے تیار کردہ تمام ضروری اشیا کی فہرست کے مطابق چیزیں خریدیں۔ انہیں بس اڈے کے قریب ایک دکاندار کے پاس رکھا اور گھر چلی گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ اپنے بھائی اور بہنوں کی پڑھائی کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔ انہیں محنت سے کام کرنے کی نصیحت کی اور اس کے بعد اپنے پہننے کے کپڑے، ٹوتھ پیسٹ، غازہ، کریم، نہانے اور کپڑے دھونے والا صابن اور آٹے کا تیل ایک بیگ میں ڈالا۔ تیسرے دن اسے واپس گاؤں میں اپنی ڈیوٹی پہ جانا تھا۔ اس نے ماں کو گھر کا کوئی بھی کام کرنے نہیں دیا۔ اس نے کہا۔

”اماں آپ آرام کیجئے، میں گھر کے سبھی کام خود کروں گی؟ ابھی میں دو دن گھر پر رہی ہوں کسی بھی چیز کی فکر نہ کیجئے گا۔“

ماں کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکل گئی ”جیتی رہو میری بیٹی سدا خوش رہو اللہ تمہیں تندرستی اور لمبی عمر بخشے۔“

ذلّٰف بی بی نے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے میلے کپڑے واشنگ مشین میں ڈالے۔ کچھ وقت کے بعد انہیں مشین سے نکال کے دھوپ میں سکھانے کے لئے ڈال دیا۔ گھر آنگن میں پڑی ہر چیز کو صاف ستھرے طور پر ترتیب سے رکھا۔ شام کا کھانا تیار کیا اور اس کے بعد اپنے گھر کے لان میں اپنی چھوٹی بہن عاقلہ کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ اپنی بہن کے ساتھ کھیلتی رہی پھر اچانک اس کے کانوں میں شہر کی جامع مسجد سے نماز مغرب کی اذان گونجی تو اس نے کھینا بند کر دیا اور اپنی بہن کو نماز پڑھنے کو کہا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد اس نے ماں اور باپ کے سر میں تیل لگایا خوب مالش کی اور اس کے بعد نماز عشا پڑھ کے سو گئی۔

دو دن کے بعد ذلّٰف بی بی گاؤں میں اپنی ڈیوٹی پہ چلی گئی۔ اس نے اسکول آفس

کاسمان سڑک کے کنارے ایک دکان پہ منی بس سے اتار کے رکھا۔ دکاندار نے اس کے ساتھ ایک مزدور سامان لے کر بھیجا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ مزدور کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں پہنچ گئی۔ اس نے اسکول کھلوا دیا اور سارا سامان اسکول آفس میں رکھوایا۔ مزدور کو مزدوری دی اور اپنے ڈیرے پہ چلی آئی۔ سفر کی تھکان کی وجہ سے اسے اپنے آپ میں درد کی ٹیسیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔ اس نے غفار چودھری اور ان کے اہل خانہ کی خیریت معلوم کی۔ اپنے بیگ سے ان کی پوتی کے لئے جھنجھنا نکال کر اسے پکڑا یا وہ بڑی خوش ہوئی اور اس سے کھیلنے لگی۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ذلفاں بی بی سو گئی۔ صبح وہ کوئل کی کوک اور پیپے کی چمک سن کے بیدار ہوئی۔ وہ اٹھی، چائے ناشتے سے فارغ ہوئی اور اسکول چلی گئی۔ اسکول میں اس نے بھنگن کو بلایا اسکول آفس اور باقی تمام کمروں کی صفائی کروائی۔ پھر ان تمام چیزوں کو ترتیب سے اسکول آفس میں رکھا جو وہ شہر سے خرید لائی تھی۔ آخر میں جب اس نے بچوں سے پیسے کی گھنٹی بجوائی تو اس کی بازگشت کانوں میں رس گھولنے لگی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اسکول کے گرد و نواح کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ ان کی نگاہیں اسکول پہ مرکوز ہو گئیں۔ اسی دوران بھوشن لال اسکول پہنچ گئے۔ انہوں نے جونہی اسکول آفس میں قدم رکھا تو ہر چیز کو سلیقے سے رکھا ہوا پا کر خوش ہو گئے۔ ذلفاں بی بی نے آداب بجالاتے ہوئے ان سے پوچھا:

”سر اب آپ کو اسکول کا آفس کیسا لگ رہا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا ”بہت اچھا لگ رہا ہے آپ نے کوئی کسر نہیں رکھی ہے۔“
 پرارتھنا کرنے کے بعد جب ابھی بچے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے تو بھوشن لال نے ذلفاں بی بی کو آفس میں بلایا اور کہنے لگے۔ ”میں نے آپ کو چار دن کی ڈیوٹی پہ رکھا ہے اور تین دن خالی رکھے ہیں۔ اس لئے آپ ان تین دنوں کے دستخط کر لیجئے۔“
 ذلفاں بی بی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا وہ کہنے لگی۔

”سر آپ میری ان تین دنوں کی چھٹی لگا دیجئے میرا ضمیر نہیں مانتا ہے کہ میں دستخط کروں اور یوں بھی جب میں یہاں نہیں تھی تو اس کے باوجود میں دستخط کروں یہ تو گناہ ہے۔“

بھوشن لال حیرت سے اس کا چہرہ ٹکنے لگے پھر بولے
 ”ذلفاں بی بی آپ ان تین دنوں کے دستخط کر لیجئے یہاں کون دیکھ رہا ہے۔“

ذلفاں بی بی نے جواب دیا

”سرودہ نیلی چھتری والا تو دیکھ رہا ہے“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی
 سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ بھوشن لال نے مجبور ہو کر ٹیچر حاضری
 رجسٹر پہ ذلفاں بی بی کی تین دنوں کی چھٹی لکھ دی۔ وہ اٹھی اور
 پانچویں کلاس میں پڑھانے چلی گئی۔ اس نے بلیک بورڈ پہ بچوں کو
 حساب سمجھایا، پھر انگریزی اور سائنس پڑھائی۔ ان کی کاپیاں چیک
 کیں، صحیح پڑھنا لکھنا اور بولنا سکھایا۔ آدھی چھٹی کے بعد جب وہ
 چوتھی جماعت کے بچوں کو پڑھانے گئی تو کرسی پہ بیٹھتے ہی اس کے
 پاس ایک بچہ روتا ہوا آیا اور دوسرے بچے کی شکایت کرنے لگا۔
 ”میڈم جی! اس نے مجھے تھپڑ مارا“

دوسرے لڑکے نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ”میڈم جی! اس نے مجھے

گالی دی۔“

ذلفاں بی بی نے دونوں کو سمجھایا اور واپس اپنی جگہ بھیج دیا۔ بچوں کے شور اور ان
 کی طرح طرح کی شکایتیں سن کر کبھی کبھی وہ جھنجھلاہٹ میں آ کر ان کے کان مروٹی اور جب
 بچے پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتے تو وہ خوشی محسوس کرتی۔ بچوں کی نفسیات کا خیال رکھتے
 ہوئے انہیں نصیحت آمیز چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی، بچے کبھی تو ہنستے اور کبھی حیران رہ جاتے۔
 ذلفاں بی بی کو بحیثیت رہبر تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں کام کرتے اب تقریباً تین
 ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ماہانہ پروگریس رپورٹ کے لئے اسے سرٹیفکٹ اور پنچوں کے دستخط
 کروانے پڑتے جس کے لئے اسے کافی دنوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر جب اسے رہبر
 تعلیم ٹیچر ز فورم نے بلاک صدر کی ذمہ داری سونپی تو اس کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے ضلع کی سطح
 پر بہت سی میٹنگوں میں شرکت کر کے پرجوش تقریریں کیں۔ ایک سال کے بعد جب ٹیچرز
 فورم نے حکومت کے سامنے اپنی تنخواہ میں اضافے کی مانگ کے لئے آواز بلند کی اور مانگ

پوری نہ ہونے کی صورت میں یہ فیصلہ کیا کہ تمام رہبر تعلیم ٹیچرز ایک روزہ احتجاجی ریلی میں شامل ہو کر سکرٹریٹ کا گھیراؤ کریں گے تو ذلّٰفان بی بی بھی باہر مجبوری اس ریلی میں شامل ہو گئی۔ پورے جوش اور دلولے اور نعرے بازی کے ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کی قیادت میں آگے بڑھ رہی تھی کہ سکرٹریٹ سے پہلے ہی چند گز کے فاصلے پر مردانہ اور زنانہ پولیس نے اس احتجاجی ریلی کو روک لیا۔ ذلّٰفان بی بی نے ہلہ بول دیا اور تمام ٹیچرز نے بیک وقت آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے لاشی چارج شروع کر دیا۔ کئی ٹیچرز زخمی ہو گئے۔ کئی ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ذلّٰفان بی بی پہ بھی ایک پولیس والی عورت نے اس کی ٹانگوں پہ بانس کے ڈنڈے سے وار کیا وہ بلبلایا کر ایک طرف گر پڑی۔ تب اسے یہ احساس ہوا کہ کسی منزل مقصود کو پانے کی خاطر آدمی کو بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ وہ سارا احتجاجی جلوس پولیس کے لاشی چارج سے تتر بتر ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی اور اپنے گھر چلی آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ دو دن گھر پہ رہنے کے بعد جب وہ ڈیوٹی پہ چلی گئی تو اسے معلوم ہوا کہ غفار چودھری کا چھوٹا بیٹا نصیر دو ماہ کی چھٹی لے کر گھر آیا ہے۔ ذلّٰفان بی بی کی اس پہ نظر پڑی تو اسے پہلی نظر میں نصیر کی نہ تو شکل و صورت اچھی لگی اور نہ ہی چال چلن۔ وہ گھر سے باہر ایک جگہ سکرٹ کے کش لے کر دھومیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑ رہا تھا۔ ذلّٰفان بی بی اس سے نظریں چرانے اور دور دور رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتی مگر وہ ہر بار اس کے سامنے آکر باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز ذلّٰفان بی بی بن سنور کے اپنی ڈیوٹی پہ جا رہی تھی کہ اچانک نصیر اس کی راہ میں حائل ہوا اور کہنے لگا:

”ہم ترستے ہیں تم سے باتیں کرنے کے لئے اور تم نے ہم سے باتیں تو دور نگاہیں تک چرانے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

ذلّٰفان بی بی نصیر کی باتیں سن کر حواس باختہ ہو گئی۔ شرم و حیا سے اس کا چہرہ عرق آلود ہو گیا۔ اس نے نصیر کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ہمت کر کے صرف اتنا کہا:

”میرے راستے سے ہٹ جائیے میں اسکول کے لئے لیٹ ہو رہی ہوں۔“

نصیر راستے سے ہٹ گیا اور ذلّٰفان بی بی آگے بڑھی، اسے شراب کی بوسی آنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اسکول میں وہ سارا دن مایوس رہی، نصیر کی

باتوں پر اسے اندر ہی اندر غصہ آ رہا تھا پھر اس نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ وہ غفار چودھری کے گھر سے اپنا ڈیرہ اٹھالے گی۔ ایک رات کہیں سے گاؤں میں چڑا آ گیا اس نے غفار چودھری کے بھائی کی چار بھیڑیں مار دیں۔ دوسرے دن سارا گاؤں چترے کی خبر سن کر سہم گیا۔ ذلفاں بی بی بھی نہایت پریشان ہو گئی۔ غفار چودھری کے گھر سے اس کے اسکول تک پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ جاتا تھا اور وہ بھی جنگلی راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد ذلفاں بی بی نے اسکول کے ساتھ ہی ترلوچن سنگھ کے گھر میں کمرہ کرائے پہ لیا، جس روز اس نے غفار چودھری کے مکان سے اپنا سامان مزدور سے اٹھوایا تو غفار چودھری دنگ رہ گئے۔ انہوں نے حیرت آمیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

”بیٹی! یہ تم کیا کر رہی ہو، یہاں کیا تمہیں کوئی تکلیف پہنچی یا کسی نے کچھ کہا، آخر کیا بات ہے؟“

ذلفاں بی بی نے جواب دیا

”نہیں چچا کسی نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ آپ سب نے مجھے بہت آرام سے رکھا لیکن کیا کروں مجبوراً یہاں سے جانا پڑ رہا ہے کیونکہ چتر گاؤں میں آ گیا ہے اور اب یہاں سے اکیلی اسکول نہیں جاسکتی ہوں مجھے چترے سے ڈر لگے ہے۔“

غفار چودھری کے منع کرنے کے باوجود ذلفاں بی بی ان کے گھر سے چلی گئی۔ ترلوچن سنگھ کو اس نے اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ وہ نہایت شریف، دیانتدار، غیرت مند اور بے باک تھا۔ اس نے ذلفاں بی بی کو یقین دلایا کہ وہ اسے اپنی سگی بہن کی طرح اپنے گھر میں رکھے گا۔ وہ اپنے لئے خود کھانا پکاتی لیکن ترلوچن سنگھ نے اس سے مہینہ پورا ہونے پر کرایہ نہیں لیا۔ ترلوچن سنگھ کی دو بیٹیاں تھیں بیٹیاں نہیں تھا۔ بڑی بیٹی دوسری جماعت میں پڑھتی تھی، ذلفاں بی بی اسے صبح و شام کو پڑھاتی۔ بچوں کی وردی، ان کی صحت صفائی، ان کے نظم و ضبط اور لکھائی پڑھائی پہ وہ خاص دھیان دیتی۔ غریب گھرانوں سے آئے ہوئے بچوں کی اس نے ایک فہرست تیار کی اور انہیں اسکول کے غریب فنڈ سے بوٹ اور گرم سوٹر خرید کر دیے۔ علاوہ ازیں ان بچوں کی بھی ایک فہرست بنائی تھی جو بغیر نہائے دھوئے اسکول

آتے تھے۔ اسکول سے تھوڑی دوری پر پانی کی ایک باؤلی پہ ہفتہ میں ایک دن ان بچوں کو اسکول سے نہانے کا صابن اور سرسوں کا تیل دے کے نہانے کے لئے بھیجا جاتا۔ اس طرح ذلفاں بی بی کی یہ حتی الوسع کوشش رہتی کہ ان کے اسکول کے بچے نہ صرف پڑھائی لکھائی میں اول نمبر پر رہیں بلکہ صحت، صفائی، تہذیب و شائستگی اور نظم و ضبط میں بھی آگے رہیں۔ ذلفاں بی بی اس دن بہت خوش ہوئی تھی جس دن اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے ہاتھوں لکھی گئی وزیرا کے نام درخواستوں میں سے بجلی اور پانی کے وزیر نے منظوری دے دی ہے اور چند دنوں کے اندر اس کے آبائی گاؤں میں بجلی کے کھمبے لگیں گے اور وائر سپلائی اسکیم والا عملہ بھی بہت جلد پانی کی پائپیں بچھانے آرہا ہے۔ ایک سال کے اندر پورے گاؤں میں بجلی کے کھمبے اور پانی کے لئے لوہے کی پائپیں بچھا دی گئی تھیں۔ دوسرے سال میں پردھان منتری گرام سڑک یोजना کے تحت ذلفاں بی بی کے گاؤں میں بھی سڑک کو منظوری مل گئی۔

ذلفاں بی بی کو اب اپنے آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول میں کام کرتے دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ بچے صحیح لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھ گئے تھے۔ ایک روز اس نے بھوشن لال کو کہا:

”سر آپ کل اسکول کمیٹی ممبران کو اسکول میں بلوایئے میں اپنی ماہانہ پروگریس رپورٹوں پہ ان کے دستخط کروانا چاہتی ہوں تاکہ میری تنخواہ نکل سکے۔“

بھوشن لال نے کہا ”ٹھیک ہے میں کل انہیں اسکول میں بلواتا ہوں“

دوسرے دن سرینچ اور اسکول کمیٹی ممبران میں سے صرف تین اسکول پہنچ گئے۔ فقیر چند نام کا ممبر کسی وجہ سے نہیں پہنچ پایا تھا۔ سب نے دستخط کئے اور ذلفاں بی بی اور بھوشن لال کو بجلی پانی اور سڑک کی منظور شدہ درخواستوں کے لئے مبارک باد دی۔ پھر جب وہ ایک دن خود اپنے اسکول کے بچے کو ساتھ لے کر فقیر چند کے گھر دستخط کروانے گئی تو فقیر چند شراب پی بیٹھا تھا۔ اس نے خمار آلود آنکھوں سے پہلے تو ذلفاں بی بی کے گل اندام پہ نظر دوڑائی پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی پروگریس رپورٹوں پہ دستخط کئے۔ ذلفاں بی بی کے ذہن و دل کے کسی گوشے سے یہ آواز ابھری کہ اس کے آبائی گاؤں میں ایک نہیں کئی

راون موجود ہیں۔

ایک بار ذلفاں بی بی گاؤں سے شہر اپنے والدین کے پاس جا رہی تھی وہ اکیلی جنگل کے راستے سے گزر رہی تھی کہ اچانک اسے ڈھول باجے کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کے اپنے گاؤں کی برات کسی دوسرے گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ دلہا گھوڑے پہ سوار تھا اور براتی اودھم مچاتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے نوجوان ڈھول بجانے والوں کے ساتھ آگے آگے ناچ رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان حال ہی میں جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکے ہیں۔ ذلفاں بی بی ڈری سہمی، شرماتی، لجاتی آہستہ سے راستے سے پرے ہٹ کے ان ہلڑبازی مچانے والے لڑکوں کی نظروں سے دور آگے نکل گئی تو ان اوباش لڑکوں میں سے ایک نے پیچھے سے اس پر فقرہ کسا ”اوسونے مار سٹیا“ اور زور سے سیٹی بجائی۔ دوسرے نے کہا ”اوئے کالہ کڈ کے لے گئی“ پھر ان چاروں نے پے درپے سیٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ ذلفاں بی بی نے اُترائی کی طرف تیزی سے قدم بڑھائے۔ وہ ان شیطانوں سے بچنے کے لئے اپنے مالک حقیقی سے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جب وہ نیچے سڑک پر پہنچی اور منی بس میں سوار ہوئی تو اسے اطمینان قلب نصیب ہوا۔ گھر پہنچ کر اسے دیکھ کر والدین اور بھائی بہن بہت خوش ہوئے۔ ماں بولی ”بیٹی! تجھ پہ واری جاؤں! آج ہی رات کو خواب میں آئی تھی۔“ دونوں ماں بیٹی

ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئیں۔ امان اللہ نے پوچھا

”بیٹی کیسی ہو خوش رہی نا؟“

ذلفاں بی بی نے کہا

”ہاں پیپا خدا کے فضل سے ابھی تک تو خوش و خرم ہوں۔ بس آپ

والدین کی نیک دعاؤں کی مجھے اشد ضرورت ہے۔“

رات کو جب سب کھانا کھا رہے تھے تو امان اللہ نے ذلفاں بی بی کو کہا ”بیٹی! اے

اے ایس کے لئے فارم بھرے جا رہے ہیں تم بھی فارم بھر لو۔“

ذلفاں بی بی متعجب ہو کر بولی

”پیپا! اے اے ایس کرنا کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے میں کے اے

ایس نہیں کر پاؤں گی۔“

امان اللہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا

”سنو بیٹی! تم اگر محنت کرو گی تو ہر حال میں کے اے ایس کا امتحان

پاس کر لو گی، بشرطیکہ تم محنت کرو، اور پھر میری یہ بات بھی یاد رکھو کہ ہر

نیا دن آدمی کے لئے اس کا اچھا یا برا مقدر لے کر آتا ہے۔“

باپ کے اصرار پر ذلفاں بی بی نے کے اے ایس کا فارم بھر دیا۔ اس نے کے اے ایس سے متعلق تمام کتابیں خریدیں۔ انہیں دن رات پڑھتی رہی۔ اسکول میں ڈیوٹی دینے کے بعد وہ رات کو دیر تک پڑھتی رہتی۔ البتہ کچھ دن سے اس کے بستر میں پیسوں کے دخول سے اسے بڑی بے آرامی ہو رہی تھی۔ وہ جونہی سوتی تو اسے اپنے مچھلیں وجود پہ سرسراہٹ سی محسوس ہوتی۔ پھر جس دن اس نے پورے کمرے میں کیڑے مار دوائی کا چھڑکاؤ کیا تو اس رات اسے کسی حد تک آرام کی نیند پڑی۔ صبح جب اس کی آنکھیں کھلیں تو دھوپ آگن میں اتر آئی تھی۔ اسے اپنی نماز فجر کے قضا ہو جانے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھی اور چائے ناشتہ تیار کرنے میں لگ گئی۔ اس کے بعد اسکول چلی گئی۔ اسکول میں حسب معمول اس نے پرارتھنا کے بعد بچوں کی صحت، صفائی اور ان کی وردی کے علاوہ وقت کی پابندی پر خصوصی لیکچر دیا۔ اس کے بعد جب بچے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے تو اس نے حاضری رجسٹر اٹھایا اور پانچویں کلاس میں پڑھانے چلی گئی۔ کلاس میں ایک لڑکے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ ذلفاں بی بی اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس لڑکے کو جیت رام نمبردار کے لڑکے نے کلاس میں آتے وقت زور سے دھکا مارا تھا جس کی وجہ سے وہ دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا تھا۔ زخمی لڑکے کو مرہم پٹی کرنے کے لئے اسکول آفس میں لے جایا گیا۔ نمبردار کے لڑکے کو ذلفاں بی بی نے اپنے قریب بلایا، اسے پوچھنا چاہنے کے بعد قصور وار پایا اور اسے خوب پیٹا۔ لڑکے نے زور زور سے رونا شروع کیا اور پھر اپنا ہاتھ اٹھا کر گھر بھاگ گیا۔ گھر میں ماں باپ سے ذلفاں بی بی کی شکایت کی۔ اپنی سٹرین پہ پڑے ڈنڈے کا نشان انہیں دکھایا۔ اس کے ماں باپ آگ بگولہ ہو گئے۔ جیت رام اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اسکول پہنچا اور بھوشن لال کے سامنے آ کر کہنے لگا۔

”یہ اسکول ہے یا پولیس تھانہ میرے اس بیٹے کو دیکھئے میڈم نے کتنی بے دردی سے بیٹا ہے۔“ نمبردار نے اپنے بیٹے کی سرین پہ پڑا ڈنڈے کا نشان بھوشن لال کو دکھایا اور کہنے لگا۔

”آپ میڈم کو یہاں میرے سامنے بلائیے۔ یہ میڈم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ ہم نے بچے اسکول پڑھوانے کے لئے بھیجے ہیں مردانے کے لئے نہیں۔“

بھوشن لال نے ذلفاں بی بی کو اسکول آفس میں بلوایا وہ آئی اور نمبردار نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میڈم آپ نے میرے اس بیٹے کو بڑی بے دردی سے مارا ہے، بچے شرارتیں کرتے رہتے ہیں پھر کیا ہوا تھا آپ کی یہ وحشیانہ حرکت آپ کو نقصان پہنچائے گی۔“

ذلفاں بی بی نے جواب دیا

”نمبردار صاحب، آپ کا بیٹا بہت زیادہ شرارتی ہے۔ اس نے ایک لڑکے کو لہو لہان کر دیا تھا۔ آپ بھی اپنے بیٹے کو سمجھائیے کہ اسکول میں شرارتیں نہ کرے۔“

نمبردار نے کہا

”میڈم آپ ابھی نئی نئی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ قانونی طور پر ایک میجر بچوں کو مار پیٹ نہیں سکتا۔ اس لئے بچوں کو مارنے پینے سے باز آجائیے ورنہ بہت برا ہوگا۔“

بھوشن لال نے منت سماجت کر کے معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ ذلفاں بی بی چیت رام نمبردار کے ناشائستہ رویہ پہ کافی شرمسار ہوئی۔ اس نے صبر تحمل کا دامن تھامے رکھا وہ اپنے معمولات کے مطابق کام کرتی رہی۔ چیت رام نمبردار نے خفیہ طور پر ذلفاں بی بی کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے خلاف چیف ایجوکیشن دفتر میں جا کر شکایتیں کرتا کہ میڈم اسکول سے غیر حاضر رہتی ہے کبھی یہ شکایت کرتا کہ وہ میجر ز فورم کی میٹنگیں کرتی رہتی

ہے۔ غرضیکہ اس نے ذلفاں بی بی کو ہر طرح سے پریشان کرنے میں پورا زور صرف کر دیا۔ ذلفاں بی بی کے خلاف کبھی زوئل ایجوکیشن آفیسر اور کبھی چیف ایجوکیشن آفیسر انکوائری کی نوٹس جاری کرتا۔

ذلفاں بی بی اس دن بہت خوش ہوئی تھی جس دن اس نے کے اے ایس کا پہلا امتحان پاس کیا تھا اور بعد میں جب اس نے دوسرا امتحان بھی پاس کر لیا تو اس کی نگاہیں بے ساختہ طور پر خدا کا شکر بجالانے کے لئے آسمان کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ اب بحیثیت رہبر تعلیم اس کے پانچ سال پورے ہونے میں کل دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ انہی دو مہینوں کے دوران اس نے کے اے ایس کا انٹرویو بھی دے دیا۔ دو مہینے کے بعد جب اخبار میں اس نے کے اے ایس کے کامیاب امیدواروں کی لسٹ میں اپنا نام پڑھا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی کے اے ایس کر چکی ہے۔ اس کے والدین، بھائی بہنیں، اس کے خاندان والے اور اس کی سہیلیوں نے اس کی کامیابی پر بہت زیادہ خوشی منائی تھی۔ ادھر ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن نے بھی ان رہبر تعلیم ٹیچروں کی لسٹ اخبار میں شائع کرادی تھی جن کے پانچ سال مکمل ہو چکے تھے۔ ان میں ذلفاں بی بی کا نام بھی سرفہرست تھا پھر جس دن وہ اپنے آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول سے رخصت ہوئی تھی تو گاؤں کے سرینچ، بیچ، اسکول کمپنی ممبران، ترلوچن سنگھ، غفار چودھری ان کے اہل خانہ اسکول میں آئے تھے۔ سب سے پہلے بھوشن لال سینئر ٹیچر نے ذلفاں بی بی کو مبارک باد دیتے ہوئے اسے ایک ذہین، محنتی اور خوش نصیب لڑکی قرار دیا۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا پھر غفار چودھری اور ترلوچن سنگھ نے بھی پھول مالائیں پہنائیں۔ جب یہ سبھی لوگ ذلفاں بی بی کو رخصت کرنے لگے تو چیت رام نمبردار بھی کہیں سے آگیا۔ اس نے آتے ہی ذلفاں بی بی کے پیر چھو لئے اور کہنے لگا:

”میڈم! جگوان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے آپ تو دیوی کا روپ ہیں۔ میں مودکھ آپ کو پہلے پہچان نہیں پایا تھا۔ چیت رام نمبردار کی آنکھیں احساسِ ندامت سے اشکبار تھیں اور ادھر ذلفاں بی بی کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو لڑاں تھے۔



ایک اہم سوال

بدرالدین کو ایک اونچے عہدے سے سبکدوش ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ رشوت کیسے لی جاتی ہے اور کیسے دی جاتی ہے یا پھر سرکاری رقومات کو کیسے آگے پیچھے کیا جاتا ہے کہ ہیرا پھیری کرنے والا بری الذمہ ٹھہرے۔ اس تمام دھاندلی سے وہ بخوبی واقف ہیں، مزید یہ کہ وہ رشوت خوری کو مالی غنیمت تصور کرتے ہیں۔ ان کی اہلیہ زیب النساء ایک ہائر سکینڈری اسکول کی پرنسپل ہیں۔ خدا نے انہیں ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ بیٹا سول انجینئرنگ کا کورس مکمل کرنے والا ہے جب کہ بیٹی کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رہی ہے۔ دونوں اپنے ماں باپ اور وطن سے دور ہیں۔ بدرالدین کا حویلی نما مکان شہر کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ ایک روز بدرالدین اور ان کی اہلیہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں شادی میں گئے تھے۔ جنوری کا مہینہ تھا، جھوٹے دن اور طویل راتیں۔ زیب النساء آدھی رات تک شادی میں شوخ و چنچل حسیناؤں کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کرتی رہی۔ اپنی سکھی سہیلیوں کے ساتھ خوب ناچتی گاتی رہی اور بالآخر تھک ہار کر سو گئی جب کہ بدرالدین رات کو دیر تک اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ اپنی گزشتہ زندگی کے بہت سے واقعات کو بیان کرتے رہے۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد بدرالدین اور زیب النساء اپنے مکان کا دروازہ کھولنے کے بعد اندر داخل ہوئے تو گھر کی ہر چیز میں بے ترتیبی اور اٹھل پٹھل دیکھ کر ان کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا۔ مکان کی پہلی منزل سے لے کر تیسری منزل تک تمام کمروں کی الماریاں کھلی ہوئی اور لمپیاں یہاں وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ بدرالدین فوراً اس الماری کی طرف دوڑے جس میں انہوں نے نیا مکان خریدنے کے لئے پیچیس

لاکھ روپے رکھے تھے اور ان کی بیوی اپنے سنگھار بکس میں رکھے زیورات کی طرف لپکی۔ زیورات کا بکس نہ پا کر وہ پاگلوں کی طرح مکان کے باہر صحن میں آئی اور زور زور سے جھنجھٹی ہوئی کہنے لگی۔

”ہاں میں لٹ گئی! ہائے میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔“

پڑوسیوں نے اس کی دلدوز چینی سنیں تو مرد و عورتیں دوڑتے بھاگتے بدرالدین کے مکان میں آپہنچے۔ بدرالدین پر غشی طاری تھی اور زیب النساء اپنی چھاتی اور سر پیٹ رہی تھیں۔ پڑوسیوں کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ رات کو چور مکان کے کچھوڑے کی طرف لگی کھڑکی کا گرل نکال کر مکان کے اندر گھسے ہیں اور پچیس لاکھ اور تقریباً دو لاکھ روپے کے زیورات خیرا کر لے گئے ہیں۔ زیب النساء کو سونے کے کنگن، کانوں کے جھمکے، انگوٹھیاں اور گلے کا ہار بار بار یاد آ رہا تھا۔ اس نے روتے روتے اپنا ہر حال بنا رکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بدرالدین کے مکان میں گرد و نواح سے آئے مردوں عورتوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ان کے گھر سے کسی کا جنازہ نکلنے والا ہو۔ باہر سے اندر آنے والا ہر شخص بدرالدین کو ہمت و حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتا۔ چند لمحوں کے بعد ان کے دیرینہ دوست مکھن لال بھی ان کے پاس آپہنچے۔ انہوں نے بھی اظہارِ تاسف کیا اور بدرالدین کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”آپ جہاں دیدہ آدمی ہیں، بھگوان پر بھروسہ رکھئے۔ اس صدمہ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اصل میں بھگوان ہی سب کچھ کراتا ہے۔“

دوسرا ایک شخص بولا: ”دیکھئے آپ اس قدر مایوس نہ ہوں جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے خدا کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا، اس لئے ہمت و حوصلے سے کام لیں۔“

بدرالدین کی آنکھیں پُر غم تھیں ان کے آس پاس ان کے دوست و احباب اور رشتے دار بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی مجمع میں افتخار عالم بھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ حال میں ہی عالیت کی سند لے کے آئے تھے۔ پورے بارہ برس کے بعد انہیں عالیت کی سند حاصل ہوئی تھی۔ وہ دینی اور دنیوی علوم سے کماحقہ واقف تھے ”سب کچھ خدا ہی کرتا ہے“ یہ جملہ سنتے سنتے ان کے کان اب سن ہو رہے تھے۔ ان کا شکن آلود چہرہ یہ ظاہر

کر رہا تھا کہ ان کے دل میں کوئی خاص بات ہے جو انہیں ناگوار ہو رہی ہے۔ بالآخر ان سے رہائشیں گیا وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور آباد از بلند بول اٹھے:

”خواتین و حضرات! آپ میں سے تقریباً بہت سے افراد کا یہی کہنا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرواتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دن رات میں جو کروڑوں ٹن شراب پی جاتی ہے، لاکھوں زنا کے اڈے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ رشوت، ظلم و استیصال، چیزوں میں ملاوٹ، ہیرا پھیری، دھوکہ و فریب، حق تلفی، ڈاکہ زنی، غنڈہ گردی، شکم مادر میں بیٹیوں کا قتل، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے چشم پوشی غرضیکہ یہ سب کچھ کیا خدا کرواتا ہے؟ میں آپ سے اس اہم سوال کا جواب چاہتا ہوں؟“

افتخار عالم کی پُر جوش باتیں سن کر تمام مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سب کی نظریں جھک گئیں۔ ان لوگوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لمحہ بھر کی خموشی کے بعد بدرالدین نے آہستہ سے اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور ہمت جٹاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور افتخار عالم سے کہنے لگے:

”افتخار میاں! میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلے۔ میں چوروں کے خلاف رپٹ

لکھوانا چاہتا ہوں!“



چھپاسانپ

پنڈت رتن شاستری کی وضع قطع اور رفتار و گفتار ہی کچھ ایسی تھی کہ اپنے اور پرائے انہیں بھگوان کا روپ سمجھتے تھے۔ انہیں نہ صرف گیتا اور رامائن کا گیان تھا بلکہ چاروں وید بھی پڑھ ڈالے تھے۔ کاشی میں دھارمک تعلیم حاصل کی تھی۔ شاستری بھی تھے کئی منتر اور بھجن انہیں زبانی یاد تھے۔ جنم مرن کے موقع پر لوگ انہیں بڑے ادب و احترام کے ساتھ بلاتے۔ سفید رنگ کی دھوئی اور کرتہ ان کی خاص پسند تھی۔ ماتھے پہ چندن کا تلک لگائے بغیر نہ رہتے۔ سر منڈواتے لیکن بودی بڑھانے کے شوقین تھے۔ پیروں میں چمڑے کا بوٹ یا چپل پہننا مہیاپاپ سمجھتے، اس لئے کھڑاؤں پہنتے تھے۔ شادی بیاہوں میں لوگ انہیں کافی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے۔ انہیں کھانے پینے کی لذیذ اور طاقتور چیزیں کھلاتے تھے جس کی وجہ سے ان کا جسم سرتا پا گرم رہتا اور بعض اوقات ان میں کام و اسنا کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی حالانکہ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کے باپ تھے۔ سب بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ بڑا بیٹا منوہر شرما محکمہ صحت میں تیسرے درجہ کا ملازم تھا اور چھوٹا بیٹا راجن گونگا تھا وہ بالکل کچھ بھی نہیں بول پاتا تھا۔ بس ہاتھ کے اشاروں سے اپنے من کی بات سمجھاتا۔ رتن شاستری کی بیوی کلکش کماری اب تقریباً بڑھاپے کی اور بڑھ رہی تھی اس کے تمام بدن کے جوڑوں میں درد رہتا تھا۔ حسن کے آثار مٹ چکے تھے۔ اسے اپنا اور پنڈت رتن شاستری کا وجود ایک بوجھ سا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا بوجھ جسے اٹھانے کی اب اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے گھر کا کام کاج کرتی تھی لیکن پنڈت رتن شاستری جو ان تو نہیں تھے البتہ بوڑھے بھی نہیں تھے۔ جسمانی خدو خال بھی کوئی خاص پرکشش نہیں تھے مگر کسی بھی جوان ناری پہ

جونہی ان کی نظر پڑتی تو دیر تک اسے دیکھتے ہی رہتے۔ تب ان کے شریر کی پانچوں اندریوں میں کلبلاہٹ سی پیدا ہونے لگتی۔ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو بے قابو سمجھوس کرنے لگتے مگر کیا کرتے، کہاں جاتے۔ اوپر سے آج کوئی کے پنڈت، سفید دھوتی کا جھول جال، تلک دھاری، ہاتھ میں کیسری رنگ کی مالا اور ہر وقت پوتھی پتروں کی چھوٹی سی پتی اٹھائے اس بات کے لئے بھی مشہور تھے کہ وہ جادو ٹونا، گڈے تعویذ کھلانے اور کھوٹ کرنے والوں کا پتہ لگانے میں بڑے ماہر ہیں اس لئے طرح طرح کے روگی اور سحر زدہ لوگوں کا ان کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ روگیوں کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہاتھ کی لکیروں میں انہیں نامعلوم کیا کیا نظر آتا تھا۔ پھر وہ روگی کے چہرے کے تاثرات جاننے کے بعد اسے الٹی سیدھی باتیں سناتے اور صحت یاب ہونے کا یقین دلاتے ہوئے سو پچاس روپے کا نوٹ حاصل کر لیتے۔ مختلف طرح کے پاکھنڈ کرتے کرتے وہ عوام میں کافی مشہور و مقبول ہو چکے تھے۔ سرمایہ بھی اچھا خاصا اکٹھا کر لیا تھا من کی واسنا بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ ادھر ان کا بیٹا منو ہر شرم اسپتال میں نئے نئے گل کھلا رہا تھا۔ وہ اس قدر بد مزاج اور بد کردار تھا کہ اسپتال میں آنے والی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو انجکشن کے بہانے استعمال کر لیتا تھا۔ عورتیں اور جوان لڑکیاں بدنامی اور بے عزتی کے خوف سے چپ سادھ لیتیں۔ منو ہر شرم حالانکہ شادی شدہ اور تین سال کی بیٹی کا باپ تھا اس کی شادی کو چار برس ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی میناکشی انتہائی حسین تھی۔ بوٹا قد، لمبیری گھنیری سیاہ زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں، دھکتے بھرے بھرے رخسار، موتیوں کی لڑی ایسے دانت، گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹ، ستواں ناک، صراحی دار گردن، مخرومی انگلیاں، جھلمل کرتی ہری چوڑیاں، اس کا تھل تھل کرتا وجود نہایت دلکش تھا۔ اتنی خوبصورت بیٹی ہونے کے باوجود منو ہر شرم کی نظریں بہک گئی تھیں اور وہ اپنے محکمے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حرام کاری میں مبتلا تھا۔

پنڈت رتن شاستری کی بیوی مکلیش کماری اکثر بیمار رہتی تھی۔ بدن کے جوڑوں کے درد کی وجہ سے زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی۔ کروٹ بدلتی تو ہائے مری! اف! کی آوازیں اس کے منہ سے نکلتیں۔ تقریباً دو مہینے سے اس نے بستر پکڑ لیا تھا۔ میناکشی ایک اچھی بیوی حیثیت سے اپنی ساس اور سرسری خدمت کرتی تھی۔ چائے پانی، کھانا اور وقت پر ساس کو

دوا کی کھانا دہ اپنا اہم فرض سمجھتی تھی۔ میناکشی جب سے اس گھر میں آئی تھی تب سے یہ گھر بار رونق اور خوشحال ہو گیا تھا۔ اتنی اچھی بہو جو خوبصورت تو تھی ہی خوب سیرت بھی تھی اپنے بچے کا خاص خیال رکھتی تھی مگر بچے کو اس کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اتنی سندرنا ری سے جیسے وہ اوب گیا تھا اور باہر منہ مارنا اس نے نہ جانے کب سے سیکھ لیا تھا۔

رات کی تاریکی اور تنہائی میں جب پنڈت رتن شاستری بیوی کے بغیر اداس ہونے لگتے تو وہ اپنے بستر سے اٹھ کر دھیرے دھیرے بیوی کے پاس آ جاتے اور جو بچی لینے لگتے تو ان کی بیوی کملیش کماری درد کی ماری چبچ پڑتی۔ پنڈت رتن شاستری کی چھاتی پہ جیسے سانپ لوٹ جاتا۔ تب انہیں بیوی کی بیماری پہ بہت غصہ آتا اور ایک ٹھنڈا سا دھو لے کر واپس اپنے بستر پہ چلے جاتے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے بدن میں سنا سنا سا چھا گیا ہو۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ بڑے شوق سے اپنی دھرم پتی کے پاس جاتے اور مایوس ہو کر پھر اپنے بستر پر چلے آتے! آدھ درجن اولاد ہونے کے باوجود ان کی جنسی ہوس کا گھوڑا ابھی تک کمزور نہیں ہوا تھا۔

ایک روز پنڈت رتن شاستری کی بیوی کملیش کماری اپنے میکے چلی گئی تھی۔ ان کا بڑا بیٹا منو ہر اپنی ڈیوٹی پہ چلا گیا۔ گھر میں صرف ان کی بہو میناکشی، اس کی بچی منیا اور گونگا رجن تھے۔ گرمیوں کے دن تھے میناکشی نے اپنی بچی کو کھانا کھانے کے بعد سلا دیا تھا اور راجن بھی ایک الگ کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میناکشی نے دوپہر کا کھانا کھایا کچھ ہی وقت کے بعد بیٹھے بیٹھے اس پہ نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ پنڈت جی اپنے بستر پہ لیٹے ہوئے تھے لیکن نیند ان کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ تنہائی ان کو ڈس رہی تھی ان کا ذہن بار بار ناری ملاپ کی طرف دوڑ جاتا اور دل کی بے قراری کو کسی طرح بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔ جب ان کا منہ سوکھنے لگا اور پورے بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تو انہوں نے بہو کو آواز دی۔

”بہو رانی! میں پانی پینا چاہتا ہوں، میرا منہ سوکھ رہا ہے۔“

میناکشی جو کچھ ہی دیر پہلے چند لمحے آرام کرنے کے لئے بستر پہ لیٹی ہوئی تھی اپنے سر کی آواز سننے ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرنگ سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی، گلاس میں پانی انڈیا اور گھونگھٹ کاڑھ شرماتی لباتی سر کو پانی پلانے اس کے کمرے میں چلی گئی۔

پنڈت رتن شاستری نے جو نبی بہو کی بازیب کی جھنکار سنی تو فوراً بستر پہ اٹھ بیٹھے۔ میناکشی نے جو نبی پانی کا گلاس اپنے سر کی طرف بڑھایا تو سرجی اس کے پری پیکر وجود کو دیکھ کر لٹو ہو گئے۔ انہیں اپنا تمام دھارک فلسفہ، اپنے ماتھے کا تلک چھاپا اور مقام و مرتبہ سب کچھ بھول گیا۔ انہوں نے فوراً میناکشی کی گوری کلائی پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہنے لگے۔

”بہورانی! میری طرف دیکھو، آخر کب تک تم اس چاند سے مکھڑے

کو مجھ سے چھپاتی رہو گی۔ جب سے اس گھر میں آئی ہو ایک بار بھی

تمہارا چہرہ نہیں دیکھا ہوں۔ میرا من تمہارے لئے ترس رہا ہے اور تم

بھاگی جا رہی ہو بھگوان کے لئے ایسا نہ کرو۔“

میناکشی نے اپنی کلائی چھڑانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کے سر کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ وہ ایک فاختہ کی مانند دام صیاد میں پھڑ پھڑاتی رہی اور بغیر کچھ کہے پوری کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنے سر کی گرفت سے آزاد ہو مگر اس کا چھوٹی موٹی سا وجود اب کافی حد تک ٹوٹنے بکھرنے لگا تھا۔ تب اس نے اپنے سر کو کہا۔

”آپ میرے پتا جی کے سامان ہیں، ایسا نہ کیجئے کیا اس گھور پاپ

کے بعد میں آپ کی بہو کہلانے کے لائق رہوں گی؟“

لیکن پنڈت رتن شاستری پر حیوانیت کا بھوت سوار ہو چکا تھا ان کی جنسی ہوس انہیں ایک گہرے کنویں میں دھکیل چکی تھی کہ جہاں سے باہر نکلنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ میناکشی تڑپتی رہی، لرزتی رہی، سسکتی رہی، بار بار مدافعت کے لئے ہاتھ پیر مارتی رہی اپنے سر کو بھگوان کا واسطہ دیتی رہی لیکن کچھ ہی لمحوں میں اس کا سر اس کی عزت و عصمت لوٹ کے الگ ہو گیا۔

میناکشی اپنے سر کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔ وہ آنسو بہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آنے لگی تو پنڈت رتن شاستری بولے۔

”ادھر دیکھو بہورانی! جنہیں پریم روگ لگ جاتا ہے وہ ایک طرح

کے اندھے ہو جاتے ہیں جو کچھ ہوا اسے اپنے سینے میں دفن رکھنا اس

کا ہرگز کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ ہم دونوں کسی کو منہ دکھانے کے لائق

مینا کشی اپنے کمرے میں آئی۔ اس کی تین سالہ مینیا گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ مینا کشی نے جو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ آج اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنی معصوم بچی کا چہرہ دیکھتی رہی، ہچکچاہٹ کر رہی رہی، اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ غم و غصے کے جوار بھاتا میں بہت کچھ سوچتی رہی۔ اسے اپنے روپ سروپ سے نفرت سی ہو رہی تھی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے سوچ کے مختلف دائرے اسے پریشان کئے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا وہ اپنے میکے بھاگ جائے اپنی ماں سے اس بھیانک واقعے کا ذکر کرے لیکن فوراً اسے اپنے والدین اور خاندان والوں کی عزت کا خیال آیا اس لئے اس نے یہ قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر اپنے پتی سے اس واقعے کا تذکرہ کرے گی تو وہ اپنے باپ کی اس کالی کرتوت پر بالکل یقین نہیں کرے گا وہ یہی سمجھے گا کہ میری پتی مجھے اپنے مانتا پتا سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے ان یہ الزام تراشی کر رہی ہے اور اگر پاس پڑوس کی کسی عورت سے اپنا یہ حال بیان کرے گی تو پورے شہر میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ جیتے جی اس کی زندگی ترک بن جائے گی۔ بدنامی کا طوق جب اس کے گلے میں پڑ جائے گا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ بالآخر وہ سوچتے سوچتے اس فیصلے پر پہنچی کہ وہ آتم ہتیا کرے مگر اچانک اس کی نظر اپنی پیاری بچی مینیا پہ پڑی جسے فرشتے نیند کے عالم میں گدگدی کر کے مسکرانے پر مجبور کر رہے تھے۔ مینا کشی کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں اپنی بچی کی متا جھلک پڑی۔ اسی کے ساتھ اسے یہ بھی خیال آتا کہ آتم ہتیا کرنے والے کو بھگوان کبھی معاف نہیں کرتا۔ جب اسے سوچتے سوچتے ذہن کے صحرا میں چاروں طرف مہیب سیاہ بادل چھائے معلوم ہوئے تو اس نے صبر کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ معمول کے مطابق گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ اس نے کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی عظیم صدمے سے دو چار ہوئی ہے۔ عورت دنیا میں کتنی مجبور اور مظلوم رہی ہے اسے اس کا پورا اندازہ ہو چکا تھا۔

تقریباً ایک ہفتے کے بعد پنڈت رتن شاستری نے پھر انگریزی لینا شروع کر دی۔ اب کی بار ان کی بیوی کملیش کماری اپنے بیٹے منوہر کے ہمراہ اسپتال گئی ہوئی تھی اور گونگا

راجن بازار گھومنے چلا گیا تھا۔ گھر میں میناکشی اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی بچی منیا کو لوری سنا کر سنانے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ وہ ایک طرف ہو کر گھر کا کام کاج اطمینان سے کر سکے۔ منیا کی فرمائش اور اس کی ضد اسے کوئی بھی کام کرنے نہیں دیتی تھی بلکی بلکی ہچکیاں اور میٹھی میٹھی لوری سنتے سنتے تھوڑی کے بعد منیا سو گئی۔ میناکشی انھی اور کمرے میں ہر چیز کو سلیقے سے ترتیب دینے لگی۔ اس نے صوفہ سیٹوں پر چڑھے میلے کور اتارے گھر والے کے میلے کپڑے اٹھائے اور کپڑے دھونے والی مشین میں ڈال آئی۔ وہ جونہی واپس اپنے کمرے میں آئی اسی وقت پنڈت رتن شاستری بھی ہانپتے کانپتے اس کے کمرے میں آ پہنچے۔ میناکشی نے اپنے راون صفت سر کو دیکھ کر فوراً گھونگھٹ میں اپنا چہرہ چھپایا اور ڈری سہمی ہوئی جونہی کمرے سے باہر جانے لگی تو پنڈت رتن شاستری دروازے پر کھڑے ہو گئے اور میناکشی کو کہنے لگے:

”بہورانی! تمہارے بغیر اب مجھے گھر میں رہنا نہیں جاتا۔ من بھاری ہونے لگتا ہے اک اگنی سی ہر طرف شریر میں جلتی رہتی ہے۔ میں کہاں جاؤں کیا کروں؟ تمہاری ساس بیمار رہتی ہے مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی ان دیکھی شکستی مجھے تمہاری اور دھکیل رہی ہے۔ بہورانی مجھے تمہارے بغیر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔“

میناکشی دیر تک اپنے سر کی گرفت سے چھٹکارا پانے کا جتن کرتی رہی۔ بہت تڑپی، گڑگڑائی مگر سر سر کا پتھر دل نہیں پیجا۔ حیوانیت انسانیت پر غالب آ چکی تھی۔ میناکشی ایک بار پھر اپنے سر کی جھنسی ہوس کا نشانہ بنی تھی مگر اب کی بار اس کی حالت ایک بھری ہوئی شیرینی کی سی تھی۔ اس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند ہو چکی تھیں، اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے سنگھار دان کے سامنے پڑے کورے کاغذ اور پن کو اٹھانے کے بعد پولیس آفیسر کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے اس طرح کے الفاظ لکھے:

”ایک دکھیاری کا خط پولیس کے نام! میں میناکشی شرما اپنی منوہر شرما عمر چوبیس برس بذریعہ خط پولیس کو یہ اطلاع دینا

چاہتی ہوں کہ میرا سر پنڈت رتن شاستری دو مرتبہ زبردستی میرے ساتھ منہ کالا کر چکا ہے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب اس نے میری عزت و عصمت لوٹی تھی تو میں نے بہت سی باتیں سوچ کر صبر کا کڑوا گھونٹ پی لیا تھا لیکن آج پھر اس نے میرے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔ اب میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے میں مجبوراً خودکشی کر رہی ہوں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میری موت کا ذمہ دار میرا سر ہے جس نے مجھے خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔

دھیاری میناکشی شرم آج سنسار والوں سے ہمیشہ کے لئے وداع ہو رہی ہے۔“ میناکشی نے خط لکھنے کے بعد اسے اچھی طرح سے لفافے میں بند کیا، اپنی شادی پہ خریدی چنری کو سیلنگ فین سے باندھا اور خط کو اپنے گلے کے ساتھ رکھ کر پھندا بنا کر فین کے ساتھ لٹک گئی۔ چند لمحے تڑپی اور اس کے بعد اس کے بدن سے روح جدا ہو گئی۔ آنکھیں پتھر اگئیں اور گردن ایک طرف کو مڑ گئی۔ چہرے پہ خون کی سیاہی سی چھا گئی، موت نے زندگی پہ فتح پائی!

منوہر شرم اور اس کی ماں جونہی گھر کے اندر داخل ہوئے تو میناکشی کی لاش سلینگ فین کے ساتھ لٹکی دیکھتے ہی دونوں ماں بیٹے زور سے چیخ پڑے۔ ان کی چیخیں سن کر پنڈت رتن شاستری بھی اپنے کمرے سے باہر آئے اور وہ بھی میناکشی کو دیکھ کے منہ بسور نے لگے۔ منوہر ڈھاریں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہمسایوں نے جب ان کی چیخ و پکار سنی تو وہ بھی بھاگتے دوڑتے وہاں پہنچے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کہرام مچ گیا۔ میناکشی کے میکے والوں کو فوراً یہ اطلاع دی گئی کہ ان کی بیٹی نے خودکشی کر لی ہے لہذا آ کے خود اپنی آنکھوں کو دیکھ لیں۔ چند آدمی پولیس کو اس بھیانک واقعے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ اب منیا بھی جاگ چکی تھی اور اپنی ماں کے پاؤں سے لپٹی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ پنڈت رتن شاستری بوکھلائے ہوئے گھر کے اندر باہر پھر رہے تھے۔ منوہر نے روتے روتے اپنا برا حال کر دیا تھا۔ وہ میناکشی کی خودکشی پر حیران تھا۔ اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ میناکشی ایسا لرزہ خیز کام کرے گی۔ کچھ ہی وقت کے بعد ڈی ایس پی صاحب اپنے سپاہیوں کے ہمراہ پولیس کی گاڑی سے نیچے اترے اور پنڈت رتن شاستری کے گھر میں داخل ہوئے۔ تمام

رشتے دار اور شہر کے لوگ یہاں جمع تھے۔ پولیس نے جب میناکشی کی لاش فرش پہ رکھی اور اس کے گلے میں پڑے پھندے میں ایک خط دیکھا تو سب حیران رہ گئے۔ سپاہی نے اپنے آفیسر کو خط دیا۔

ڈی ایس پی صاحب نے میناکشی کے ہاتھ کا لکھا خط سب کو زور سے پڑھ کر سنایا تو تمام رشتے دار، پاس پڑوس والے اور شہر کے معزز لوگ ششدر رہ گئے۔ ڈی ایس پی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ انہوں نے غصے کی حالت میں سب کے سامنے پنڈت رتن شاستری کو لاتیں اور کئے مار مار کر پولیس کی گاڑی میں بٹھایا اور میناکشی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دیا۔ جب لاش اٹھانے لگے تو منوہر شرما کی تین سالہ بچی خیا جیچ جیچ کر کہنے لگی ”مجھے میری ماماں کے ساتھ لے چلو۔“



چہرہ چھپائے لوگ

راج محمد کی اکلوتی بیٹی شہر کے زمانہ کالج میں بی اے سال دوم میں زیر تعلیم ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی بہتر تعلیم و تربیت اور اسکے روشن مستقبل کی فکر میں نہایت سنجیدگی برتی ہے۔ انہیں یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ ان کی بیٹی جدید تہذیب کی زہریلی ہواؤں کا شکار ہو کے نہ رہ جائے۔ چونکہ وہ جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکی تھی، راج محمد بڑے دور اندیش ہیں، انہوں نے نہایت نرم لہجے میں اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”میری بیٹی! میری نصیحت آمیز باتوں پہ عمل کرنا، بیٹیاں گھروں کی زینت اور رحمت ہوتی ہیں لیکن جب ان کے قدم بہک جاتے ہیں تو ماں باپ کے لئے زحمت اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں تم علم کی شمع بنو، رونق محفل نہ بنو، تم کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرو لیکن تمہارے رخ پہ نقاب رہے تاکہ تم پہ کسی غیر محرم کی نگاہ نہ پڑنے پائے۔“

باپ کی باتیں سن کر بیٹی کے ماتھے پہ پینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں تھیں تب اس نے باپ کو یقین دلاتے ہوئے کہا تھا۔

”پاپا! میں آپ کی باتوں پہ زندگی کے آخری لمحے تک عمل پیرا ہوں گی۔ آپ میری فکر نہ کیجئے گا، جیسا آپ چاہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گی“ بیٹی کی باتیں سن کر باپ کو اس وقت ذہنی سکون اور اطمینان قلب نصیب ہوا تھا۔

آج راج محمد اپنی بیٹی کے کالج کے گیٹ کے باہر ایک درخت کے سائے میں اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنے دوست کے گھر میں ہو رہی شادی کی

تقریب میں لے جانے کے لئے آئے تھے۔ چھوٹی بڑی گاڑیوں اور لوگوں کی بے ہنگم آوازیں چاروں طرف سے انہیں سنائی دے رہی تھیں وہ نہ معلوم کس گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ چانک اُن کی نظر موٹر سائیکلوں پہ سوار تین نوجوانوں پہ پڑی، انہوں نے اپنی موٹر سائیکلیں کالج گیٹ کے قریب ہی ایک طرف کھڑی کر دیں۔ تینوں کے چہرے ہشاش بشاش تھے اور ان کی نظریں متلاشی معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد کالج کے گیٹ سے تین طالبات موبائل فون کان سے لگائے، ہنستی مسکراتی، باہر آئیں اور اپنے اپنے من پسند عاشقوں سے ہنستے مسکراتے باتیں کرنے لگیں۔ ٹی شرٹوں اور زین کی پینٹوں میں ملبوس ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کے راج محمد ششدر سے رہ گئے۔ انہوں نے آسمان کی وسعتوں پہ نظریں دوڑائیں اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کے چہروں سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پہلی بار آپس میں مل رہے ہوں اور اب وہ یہاں سے نکلنے کے لئے بیتاب تھے۔ وہ اپنوں اور بیگانوں کی نظروں سے دور جانے کے خواہشمند نظر آرہے تھے کسی ایسی جگہ جہاں تنہائی ہو، ایسی جگہ کہ جہاں پہنچ کر وہ ایک دوسرے کے جذبات، احساسات اور نفسیات کو سمجھ سکیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ لڑکیاں اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ جب وہ وہاں سے موٹر سائیکلوں پہ سوار ہوں تو انہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ اور اگر کسی کا بھائی، باپ یا کوئی رشتہ دار اسے کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پہ سوار جاتے دیکھ لے گا تو نہ صرف بڑی بدنامی ہوگی بلکہ پستول اور چہرے تک جسموں پہ استعمال ہوں گے۔ تینوں مشورہ کرنے لگیں اُن میں سے پونم نے یہ رائے دی کہ ”چلو ہم تینوں یہاں سے کچھ دور تک پیدل چلیں اور پھر آگے سے موٹر سائیکلوں پہ سوار ہو جائیں۔“ دوسری لڑکی ہر پریت کور نے اُس کی رائے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”پیدل چلتے چلتے تو ہم تھک جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو جانا چاہئے۔ ماڈرن دور ہے ہمیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

تیسری لڑکی فوزیہ بانو سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی:

”میری یہ رائے ہے کہ ہم تینوں اپنے اپنے چہرے کو دوپٹے سے

ڈھانپ لیں۔ بس صرف آنکھیں کھلی رکھیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک یہ کہ ہمیں کوئی بھی پہچان نہیں پائے گا اور دوسری بات یہ کہ ہم شریف گھرانوں کی باعزت اور باحیا لڑکیاں تصور کی جائیں گی۔“

سب نے پُر مسرت لہجے میں اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اب تینوں لڑکیاں نقاب پوش سی لگ رہی تھیں، وہ اپنے اپنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو گئیں اور دیکھتے دیکھتے تینوں موٹر سائیکل آہستہ آہستہ مندریوں، مسجدوں اور گورو دواروں والے اس شہر کی گاڑیوں اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے باہر نکلنے لگے۔ راج محمد نے بھی اُن کے پیچھے اپنی گاڑی اسٹارٹ کر دی یہ سوچتے ہوئے کہ دیکھوں آخر یہ کہاں جا رہے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں تینوں موٹر سائیکلوں کی رفتار تیز کر دی گئی۔ اب یہ تینوں موٹر سائیکل ایک بڑی کشادہ سڑک پہ ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے جنوبی ایک دریا کا پل پار کیا تو تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے چہروں سے دوپٹے ہٹا دیئے اور خوشی کے مارے چہکنے لگیں۔ پل پار کرنے کے بعد دور آگے قومی شاہراہ کے ایک موڑ پہ انہوں نے اپنے اپنے موٹر سائیکل کھڑے کر دیئے۔ تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے عاشق کا ہاتھ تھاما اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک کالے گھنے جنگل میں چلے گئے۔ راج محمد اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے محوئے حیرت تھے۔ اُن کے ذہن و دل کو بار بار یہ سوال نوج رہا تھا کہ اس کالے گھنے جنگل میں اب یہ کیا کریں گے؟؟؟



آنکھوں کی عصمت دری

پنڈت میگھ ناتھ کی عمر اب اکاون برس سے تجاوز کر چکی تھی مگر اب بھی وہ اپنے پتاجی کی اس مار کو نہیں بھول پائے تھے جو انہوں نے ساتویں جماعت میں کھائی تھی۔ ریتا نام کی ایک لڑکی ان کے ساتھ پڑھتی تھی۔ لڑکی سچ ذات کی تھی، ایک دن ریتا کی کاپی پر میگھ ناتھ نے ”پیار“ کا لفظ لکھا تھا اور نیچے ساتھ میں نادانی سے اپنا نام بھی لکھ دیا تھا۔ ریتا نہایت شرمیلی اور غیر متوند لڑکی تھی۔ گھر آ کر جب وہ پڑھنے لکھنے بیٹھی تو سب سے پہلے جو کاپی اس کے ہاتھ لگی وہ ہندی کی کاپی تھی۔ کاپی کے پہلے اندرونی صفحے پر اس کی نظر لال سیاہی سے لکھے لفظ ”پیار“ پر پڑی تو وہ چونک گئی، نیچے لال سیاہی سے ”میگھ ناتھ“ لکھا ہوا تھا۔ ریتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ روتی ہوئی اپنی ماں کے پاس گئی اور اس سے بولی ”اماں! پڑوس کے پنڈتوں کا چھورا میری کاپی پہ پیار کا شبد لکھے ہے۔“

ریتا کی ماں نے کاپی دیکھی تو آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے زور سے دو تین تھپڑ ریتا کے گال پر جھڑ دیئے اور چیختی ہوئی بولی تھی:

”اس رنڈوے کے ہاتھوں میں کیسے تری کاپی پہنچی۔ مجھے بتا؟، ورنہ تیری بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو کھلا دوں گی؟“

ریتا گڑ گڑاتی ہوئی کہنے لگی تھی:

”اماں مجھے نہیں معلوم اس نے کب میری کاپی پہ پیار کا شبد لکھا ہے! میں سچ کہتی

ہوں، میرا منوا صاف ہے۔“

ریتا کے باپ کو مرے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ ماں ہی اپنے تین بچوں کی

کفالت میں جُٹی ہوئی تھی۔ ریتا سے چھوٹا اس کا ایک بھائی اور ایک تین سال کی بہن تھی۔ ریتا کی ماں کے ہاتھ میں کاپی تھی۔ اس نے ریتا کو بازو سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹتی ہوئی اسے پنڈت شنہو ناتھ کے گھر لے گئی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی اس نے گھونگھٹ کاڑھا اور بڑے غم و غصے کے ساتھ پنڈت شنہو ناتھ سے اس کے بیٹے میگھ ناتھ کی شکایت ان الفاظ میں کی تھی:

”پنڈت جی! آپ کے بیٹے نے میری بیٹی کی کاپی پر ”پیار“ کا شبد لکھا ہے، اگر آپ جیسے مہمان لوگوں کے بیٹے اتنی چھوٹی عمر میں بکنے لگیں تو عام لوگوں کے بچوں کا کیا حال ہوگا؟“

پنڈت شنہو ناتھ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھے اپنے کنبے کے افراد کے ساتھ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ ریتا کی ماں کی باتیں سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے پاؤں تلے جیسے زمین کھسکتی جا رہی تھی۔ اپنے کانوں پہ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے میگھ ناتھ کی شکایت سن رہے ہوں۔ پنڈت شنہو ناتھ مانے ہوئے پنڈت تھے، ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا، بیاہ اور جنم مرن کے موقع پر لوگ انہیں بڑی عقیدت سے بلاتے تھے، مگر آج انہیں ریتا جیسی بچہ ذات کی لڑکی کی ماں جو کچھ سن رہی تھی، اسے وہ کن کانوں سے سن رہے تھے، یہ وہی جانتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ریتا کی ماں نے ان کے ہاتھ میں کاپی دیتے ہوئے کہا تھا:

”یہ دیکھئے آپ کا بیٹا میری بیٹی سے کیا چاہتا ہے۔ پنڈت جی، ہم بھلے ہی بچہ ذات کے لوگ ہیں لیکن اتنے گرے ہوئے نہیں ہیں کہ اپنی عزت کا خیال ہی نہ رکھیں۔“

ریتا کی ماں کی باتیں پنڈت شنہو ناتھ کے دل کو چھلنی کر گئی تھیں انہوں نے ریتا کی ماں کو کہا تھا:

”ذرا دھیرج رکھیے، سب کچھ آپ کے سامنے ہوگا“ یہ کہتے ہوئے پنڈت شنہو ناتھ ایک دم اپنے بیٹے میگھ ناتھ پر اس طرح چھپٹ پڑے تھے جس طرح شیر بکری پر، پھر کیا تھا انہوں نے سب کے سامنے میگھ ناتھ پہ لاتوں اور تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ غصے کی حالت میں دانت کچکچاتے ہوئے وہ اپنے بیٹے میگھ ناتھ کو زمین پر پٹک رہے تھے، پھر دونوں کانوں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے اسے کہنے لگے تھے:

”تجھ حرام غرو کی یہ ہمت کہ اس عمر میں ہی ”پیار“ کا شہد لکھنے لگا۔“ میگھ ناتھ رو رہے تھے ان کی ماں انہیں چھڑانے آئی تو پنڈت شنہو ناتھ نے اسے زور سے دھکا دیا، وہ دور منہ کے بل گر پڑی اور ”ہائے مری“ کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ میگھ ناتھ کی دو بڑی بہنیں اپنے بھائی کو چھڑانے آگے بڑھیں اور دہائی دیتی ہوئی کہنے لگیں:

”پتاجی! ایک بار اسے ہمارے کہنے پر معاف کیجئے اب یہ کبھی بھی پیار کا شہد نہیں لکھے گا۔“

مگر پنڈت شنہو ناتھ نے اپنی بیٹیوں کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اب انہوں نے ہاتھ میں نائلن کی رتی لے لی تھی۔ وہ رسی میگھ ناتھ کی ناگوں اور کمر پر زور زور سے اس طرح مار رہے تھے جس طرح تانگے والا اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کرنے کے لئے اسے چابک سے مارتا ہے۔ میگھ ناتھ نے چیختے اور بلبلاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور کہنے لگے:

”پتاجی اب کبھی بھی زندگی میں پیار کا شہد نہیں لکھوں گا ایک بار معاف کر دیجئے!“

لیکن پنڈت شنہو ناتھ اسے مسلسل نائلن کی رسی سے مار رہے تھے۔ اسی دوران میگھ ناتھ کی دادی کے کانوں میں ان کے چیختے چلانے کی آواز پڑی تو وہ فوراً کہیں سے گرتی سنبھلتی پنڈت شنہو ناتھ کے بالکل سامنے آکے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی:

”مجھے مار میری جان لے لے، پاگل ہو گیا ہے اس کو مار دے گا کیا؟“

پنڈت شنہو ناتھ کے ہاتھ ماں کے اچانک سامنے آتے ہی رک گئے۔ ماں کو سامنے کھڑی دیکھ وہ ندامت سی محسوس کرنے لگے اور پھر ہانپتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گئے تھے۔ اب انہوں نے میگھ ناتھ کو ”گروکل“ میں پڑھانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ انگریزی اسکول سے اب انہیں نفرت سی ہو گئی تھی۔

میگھ ناتھ چار سال تک گروکل میں پڑھتے رہے۔ وہاں انہوں نے گائتری اور سرسوتی منتروں کے علاوہ بہت سے اچھے اصول و آداب سیکھے۔ اپنے من کی دانستہ پر کیسے کنٹرول پایا جائے، عورت کے چلتروں سے کیسے بچا جائے، اپنے تن اور آتما کو کیسے پاک و صاف رکھا جائے اور پھر مخصوص اوقات میں ایشور کے گمیان دھیان میں محو ہو جانا یہ سبھی

باتیں میگھ ناتھ نے گڑوکل میں سیکھ لی تھیں۔ پھر بعد میں انہوں نے پر بھاکرت کی سند حاصل کی تھی اور مکمل عوامی فلاح و بہبود میں ملازم ہو گئے تھے۔

میگھ ناتھ کے شعور اور تحت الشعور میں اپنے باپ کی شدید مار اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ وہ عورت ذات کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھتا تو دور کی بات اک ادھ نظر سے دیکھنا بھی مہاپاپ سمجھتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ بیوی سے بھی نظریں ملانے اور اس کے پاس جانے میں عار محسوس کرنے لگے۔ تب انہیں دوستوں نے سمجھایا کہ اپنی دھرم پتی سے بھوک ولاں کرنا پاپ نہیں ہوتا ہے اور اگر وہ اس کے تن من کو نہیں چھوئے گا تو وہ واپس اپنے میکے چلی جائے گی۔ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود میگھ ناتھ نے ڈرتے ڈرتے اپنی دھرم پتی کے تن من کو چھو لیا تھا اور کئی بار چھو لینے کے بعد اب وہ چار بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ انگریزی کلچر سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ تو اپنے دفتر میں دوسرے ملازموں کی نظروں میں ایک عجوبہ بنے ہوئے تھے۔ کیسری رنگ کا کرتہ، سفید دھوتی، ماتھے پر چندن کا تلمک، سر پہ بودی اور کندھے سے لٹکتا ہوا جھولا میگھ ناتھ کی ایک مخصوص شناخت تھی۔ سیدھے سادے نرم مزاج، کام، کرودھ، موبھ، لوبھ اور اہنکار سے کوسوں دور، اپنی ڈیوٹی کے پابند، زبان پر ہر وقت اوم، ہری اوم کا ورد رہتا، پرانی عورت پر نظر ڈالنا مہاپاپ سمجھتے تھے۔ صبح جب وہ اپنے دفتر کی طرف نکلتے تو راستے میں ایک کہارن اپنی دکان پر سبزی سنوری بیٹھی دکھائی دیتی، جس کے بال بکھرے ہوئے، کندھوں تک موٹی نیکی بانہیں اور قمیض کا گلا اتنا نشیبی کہ اس کی معمولی جنبش سے قدرت کا انمول خزانہ ہمک ہمک کے باہر آنے کو ترستا۔ اس کے سرخ گالوں اور موٹی موٹی آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت پر جو نمی میگھ ناتھ کی اچانک نظر پڑتی تو فوراً نظر پھیر لیتے اور گناہ کا احساس ان کے رگ وریشے میں دوڑ جاتا۔ ان کے دفتر میں جو اسٹاف تھا وہ انگریزی کلچر اور تہذیب کا دلدادہ تھا۔ بات بات پہ ماں بہن کی گالی دینا ان کا تکیہ کلام تھا۔ کچھ خواتین بھی ان کے دفتر میں کام کرتی تھیں۔ میگھ ناتھ نے اس دفتر میں آئے تھے اس لئے کچھ اسٹاف ممبرز کے لئے وہ کباب میں ہڈی بنے ہوئے تھے۔ ان کے دفتر میں ہر روز ”رنگ سنسار“ نام کا ایک اخبار آتا تھا جس میں خبریں کم اور عریاں عورتوں کی تصویریں زیادہ ہوتی تھیں۔ میگھ ناتھ کے دفتر میں کام

کرنے والے ملازم ان عورتوں کی عریاں تصویروں کو مزے مزے سے دیکھتے، ایک دوسرے کو دکھاتے اور اس طرح اپنی آنکھوں کو لذت پہنچاتے یہ تصویریں اس قدر عریاں ہوتی تھیں کہ مخصوص مقامات بھی برائے نام ہی چھپے ہوتے۔ میگھ ناتھ کی نظر جو نبی ان تصویروں پر پڑتی تو وہ شرم و حیا کی وجہ سے اخبار کو دور چھینک دیتے۔ ان کے دفتر کا کلرک جو نبی لیپ ٹاپ کھولتا تو اس پہ بھی سب سے پہلے کسی حسین انگریز ان کی تقریباً اسی فیصدی عریاں تصویر اُبھرتی۔ اسی طرح ان کیساتھ دفتر میں کام کرنے والوں کے پاس ایسے موبائل سیٹ تھے جنہیں آن کرتے ہی نیم عریاں عورت کی تصویر آنکھوں میں جنسی براخیختگی کا نشہ پیدا کر دیتی۔ میگھ ناتھ یہ سب کچھ دیکھتے ہی فوراً غم و غصے میں مبتلا ہو جاتے اور اندر ہی اندر کڑھتے۔ اپنے دفتر کے ان تمام ملازموں پہ لعنت بھیجتے جو عورت کو عریاں دیکھنے کے شوقین تھے اور یہ سوچ کے رہ جاتے کہ کیا ان کی اپنی ماں بہن نہیں ہے اور دفتر سے چھٹی ہونے کے بعد وہ سیدھے اپنے گھر پہ آ جاتے، آگے ان کے بچے ٹیلی ویژن پر "فیشن شو" اور "چتر ہار" جیسے نیم عریاں پروگرام بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے ہوتے۔ وہ بچوں کو ڈانٹتے اور انہیں آستھا، سنہکار اور ست سنگ جیسے دھارمک چینل دیکھنے پر مجبور کرتے لیکن بچے ان کے پیٹھ پھیرتے ہی پھر اپنی پسند کے وہی پروگرام دیکھنے لگتے۔ میگھ ناتھ اندر ہی اندر کڑھتے، جھنجھلاتے اور دکھی ہو کر گھر کے کسی گوشے میں رام نام چنے لگتے۔

گریموں کے دن تھے میگھ ناتھ اپنے دفتر سے تقریباً تین بجے اپنے گھر پہنچ گئے۔ نہانے اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ کچھ وقت لینے کے بعد جب اٹھے تو ان کے جی نے چاہا کہ آج وہ گاندھی میموریل پارک اور قومی وراثت ہاؤس گھومنے جائیں گے، چنانچہ وہ گھر سے نکل پڑے۔ وہ کئی برسوں کے بعد آج گاندھی میموریل پارک دیکھنے جا رہے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ حکومت نے گاندھی میموریل پارک کو اب جدید طرز میں کافی سجا رکھا ہے اور قومی وراثت ہاؤس میں نئے آرٹسٹوں نے اپنے فن کے اعلیٰ نمونے نصب کئے ہوئے ہیں۔ اسی شوق کی تحمیل میں میگھ ناتھ ان دونوں جگہوں کو دیکھنے جا رہے تھے۔ وہ جب گاندھی میموریل پارک کے مین گیٹ پر پہنچے تو پچیس روپے کا ٹکٹ خریدنے کے بعد پارک میں داخل ہوئے۔ پارک کا اندرونی منظر ان کے

مزاج اور ضمیر کے بالکل منافی تھا۔ وہ جوں جوں آگے قدم بڑھا رہے تھے انہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف ملبوسات میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے سے بوس و کنار کرتے، بغل گیر ہوتے اور حیا سوز حرکتیں کرتے نظر آئے۔ میگھ ناتھ بار بار ان پر سے نظریں ہٹاتے رہے اور دل ہی دل میں یہ فحش ماحول دیکھ کر گھٹن سی محسوس کرنے لگے۔ انہیں اپنا آدرش وادی ذہن خطرے میں دکھائی دینے لگا بالآخر وہ مجبوراً آدھی پارک دیکھنے کے فوراً بعد باہر آ گئے۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور دیر تک کھڑے یہ سوچتے رہ گئے کہ کیا یہی گاندھی میموریل پارک ہے! اب انہوں نے قومی وراثت ہاؤس کا رخ کیا وہاں پہنچے تو گیٹ پر پچاس روپے کا ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد جونہی اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مجسمہ سازوں نے عورت کے تمام پوشیدہ حصوں کو بالکل عریاں کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہوا ہے۔ مختلف مقامات پر عورت کو عریاں مجسمے کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ میگھ ناتھ نے فوراً ان پر سے بھی نظریں ہٹا لیں اور انتہائی دکھی ہوئے۔ انہیں اس وقت اپنے بپا جی کی وہ ماری یاد آئی جو انہوں نے ”پیار“ کا شبد لکھنے پر کھائی تھی۔ آخر کار یہاں بھی مایوس ہو کر گیٹ سے باہر آ گئے اور یہ سوچتے ہوئے حیران رہ گئے کہ کیا یہی قومی وراثت ہاؤس ہے! اب وہ سیدھے واپس اپنے گھر آنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد اچانک مین روڈ کے کنارے سینما ہال کے سامنے لوگوں کا جھوم سادیکھا جس میں زیادہ تر نوجوان اور ادھیڑ عمر کے مرد ایک لمبی قطار میں کھڑے نئی فلم دیکھنے کے شوق میں ٹکٹ لے رہے تھے۔ میگھ ناتھ بھی ان لوگوں کو دیکھتے ہی سینما ہال میں چلے گئے، سامنے ایک طرف دیوار پر نئی فلم کا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ اسی پوسٹر پر ایک جگہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا Only for Adults یعنی صرف شادی شدہ افراد ہی اس فلم کو دیکھیں۔ اب میگھ ناتھ کے دل میں یہ جستجس پیدا ہوا کہ آخر یہ فلم شادی شدہ لوگوں کے لئے ہی مخصوص کیوں رکھی گئی ہے؟ ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہو سکتا ہے کہ اس فلم میں ضرور کرم دھرم کو فلما یا گیا ہو۔ ان کے من میں اس فلم کو دیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ بہت جلد اب سینما ہال میں گھسنا چاہتے تھے چنانچہ وہ بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ فلم شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا، وہ ریٹے ہوئے کونز تک پہنچے اور ڈیڑھ سو روپے کا ٹکٹ خرید کر بالکونی میں جا بیٹھے۔ پورے دس

منٹ کے بعد یہ نئی فلم شروع ہو گئی۔

پہلے منظر میں ایک شادی شدہ عورت کو ایک غیر شادی شدہ نوجوان سے محبت کرتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے منظر میں ایک تالاب میں ان دونوں کو بالکل عریاں حالت میں دکھایا گیا اور پھر تیسرا منظر ناقابل بیان! میگھ ناتھ سینما ہال کی تاریکی میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اب انہوں نے آنکھیں بند نہیں رکھی تھیں بلکہ کھلی آنکھوں برابر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ڈیڑھ سو روپے کا ٹکٹ خرید کر بالکونی میں جا بیٹھے تھے۔ تیسرے منظر نے ان کے پورے وجود میں بہت زیادہ حرارت پیدا کر دی تھی جو بعد میں آتش فشاں کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب میگھ ناتھ سینما ہال سے باہر آئے تو وہ انتہائی مایوس تھے۔ ان کی آنکھوں نے آج جو کچھ دیکھا تھا وہ انہوں نے زندگی میں آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا آج جیسے سب کچھ لٹ چکا تھا، ان کے شریر میں جو اٹھل پھل ہوئی تھی وہ انہیں بار بار مایوس کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ کے سینما ہال میں آئے تھے اور کتنی قیمتی چیز لٹا کے یہاں سے جا رہے تھے! وہ یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے آج ان کی آنکھوں نے زنا کیا ہو۔



داستان یہ ماتم کناں تھا۔ کیسری رنگ کا گرتہ اور اسی رنگ کی دھوتی میں ملبوس بابا بے سندھ پڑے تھے ان کی ٹانگیں اور بازوؤں کی بے ترتیبی سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان کے جسم سے ان کی روح کا کتوبر عالم بالا کی طرف پرواز کر چکا ہو۔ ان کے جھریوں بھرے ماتھے پر سرخ رنگ کے جلک کی باریک سی دھاریاں ایسی دکھ رہی تھیں کہ جیسے کسی شرارتی لڑکے نے ان کے ماتھے پہ اوپر سے نیچے کی طرف تیز بلنڈ سے کٹ مارا ہو اور اس طرح بابا کے کمزور ماتھے پہ یہ لہو نکیرا بھرا آئی ہو۔ ان کی جٹائیں اور آدھ سفید داڑھی ان کی لغزش کی چغلی کھا رہی تھی۔ فردوس احمد بابا کو اس ہول حال میں دیکھ کر خوفزدہ سے ایک دم کھڑے کے کھڑے رہ گئے، ان کے دماغ میں بار بار سوال ابھرتا رہا کہ کیا بابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟ بابا کو کیا ہو گیا ہے، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں تو دُور دُور تک کوئی بھی آدم زاد نظر نہیں آیا، وہ ریلوے اسٹیشن کی جانب دوڑے۔ ریلوے اسٹیشن سے دائیں جانب ایک چوراہے پہ چند آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے، فردوس احمد کی نظر ان پہ پڑی تو وہ ہانپتے کا پنتے ان کے پاس پہنچے اور حواس باختہ ہو کر ان سے کہنے لگے ”آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ چلئے، ادھر پیچھے درختوں کے سائے میں ایک بابا کو کچھ ہو گیا ہے، بے حس و حرکت پڑے یوں لگ رہے ہیں کہ جیسے بابا کو کسی نے مار دیا ہو، آپ فوراً چلئے۔“

چار آدمی فردوس احمد کے ساتھ دوڑتے بھاگتے بے سندھ بابا کے پاس پہنچے، انہیں دوڑتے دیکھ کچھ اور بھی آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اب بابا کے آس پاس لوگوں کا ایک جھوم سا اکٹھا ہو گیا۔ ایک آدمی نے بابا کی نبض ٹٹولی تو معلوم ہوا کہ ان کی نبض برابر کام کر رہی ہے۔ دوسرے نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو ماتھے کی کیفیت بھی مناسب معلوم ہوئی۔ دو آدمی بابا کے پیروں کو تلمسنے لگے یہ سوچتے ہوئے کہ ضعف کے باعث کہیں ان پہ بے ہوشی نہ طاری ہوئی ہو۔ کسی کی بھی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر بابا کو کیا ہو گیا ہے، ابھی لوگ اسی منہ سے الجھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ناگپال جیسا چھٹا ہوا بد معاش اور شرابی کہیں سے آ نکلا۔ اس نے بابا کو دیکھتے ہی ان کی کیفیت بھانپ لی۔ وہ پہلے زور سے ہنسا اور پھر کہنے لگا ”ارے چھوڑو اس بابا کو اس نے فرونی پی ہے! یہ وہی بابا تو ہے جو ابھی پچھلے ہفتے اسی شہر میں ایک

جگہ سینکڑوں مردوں اور عورتوں کو رام کتھا سنا رہا تھا!“

ناگپال کی باتیں سن کر سب لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔
اب وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ بابا کو ہوش میں لانے کے لئے اسپتال لے چلیں یا
پولیس تھانے کی طرف۔



باہر اور اندر کا منظر

سیواناتھ کی مٹھائیوں کی دکان ”دین دھرم سوٹ شاپ“ کے نام سے ملک بھر میں محض اس لئے مشہور و معروف ہو گئی تھی کہ وہاں خالص دیسی گھی سے مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ دکان ایک کوہستانی علاقے سے گزرنے والی شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ اس دکان کے آس پاس مٹھائیوں کی اور بھی دکانیں ہیں ان کے علاوہ چائے، پان، کولڈ ڈرنک اور سبزی و پھل فروشوں کی بھی دکانیں ہیں مگر سیواناتھ کی ”دین دھرم سوٹ شاپ“ کو جو مرکزیت، اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے وہ کسی دوسری دکان کو حاصل نہیں ہے۔ دراصل یہ دکان ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو قدرتی ماحول و مناظر سے آراستہ و پیراستہ ہے اور اسے سیاحوں کے لئے دلکش بنانے میں حکومت نے خاصی محنت سے کام کیا ہے۔ سیواناتھ کی دکان کے سامنے سے گزرنے والی تقریباً تمام سیاحوں کی گاڑیاں چند لمحوں کے لئے یہاں ضرور رکتی ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان بڑے شوق سے گاڑیوں سے باہر نکلتے ہیں اُن کے چہرے فطری ماحول کو دیکھتے ہی بارونق ہو جاتے ہیں وہ اپنے اپنے کیمروں اور قیمتی موبائل فونوں سے اپنی اور اس دلکش ماحول کی تصویریں کھینچتے ہیں تاکہ اپنی یادوں کے البم میں انہیں محفوظ رکھ سکیں۔ سیواناتھ کی دکان پہ مٹھائیاں خریدنے والوں کی کافی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ سویرے سات بجے سے رات کے بارہ بجے تک سیواناتھ کی دکان کھلی رہتی ہے۔ دکان کو نہایت دیدہ زیب بنایا گیا ہے تاکہ یہاں سے گزرنے والا ہر مسافر اس دکان میں داخل ہونے اور یہاں سے اپنی پسند کی مٹھائی خریدنے کے لئے بیتاب ہو جائے۔ دکان کے آگے بڑے اور خوب صورت ڈیزائن میں بورڈ آؤیز لگایا گیا ہے

جس پہ ہندی، اردو اور انگریزی میں موٹے موٹے لفظوں میں ”دین دھرم سویٹ شاپ“ لکھا گیا ہے اور آخر پہ یہ خوش گن سطر لکھی گئی ہے کہ ”یہاں پہ خالص دیسی گھی سے میٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔“ دکان کے دائیں بائیں اور سامنے دیواروں پہ پتیسہ، کراچی حلوہ، جلیبی، سون پا پڑی، مین برنی، گلاب جامن، شانہ مرغی، امرتی، میسواور گجر بلا میٹھائیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ سیوانا تھہ دور اندیش اور تجارتی ذہنیت کے حامل ہیں اپنی اس دکان سے آج تک وہ کروڑوں روپے کمائے ہیں۔ تقریباً بیس برس سے یہ دکان چلا رہے ہیں۔ ایک درجن نوکر چاکر، ہر وقت میٹھائیاں تیار کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں الگ الگ کام سونپے گئے ہیں کچھ اندر چاشنی تیار کرتے ہیں کچھ میٹھائی تیار ہونے پر اُسے ترتیب سے ایک طرف رکھتے ہیں اور کچھ بڑے خوشنما ڈبوں میں میٹھائیاں ڈالتے اور انہیں سیوانا تھہ کی میٹھک کے سامنے یہاں وہاں رکھتے ہیں۔ میٹھائی کے ڈبے نہایت دیدہ زیب اور خوش نما معلوم ہوتے ہیں جن پر ”دین دھرم سویٹ شاپ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ میٹھائی خریدنے والے اکثر قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ ایک سو روپے سے لے کر پانچ سو روپے تک میٹھائی کا ڈبہ لے جاتا ہے۔

جون کا مہینہ تھا، گرمی اپنے پورے جو بن پر تھی گرم علاقوں کے صاحب ثروت لوگ سیر و تفریح کے لئے سرد علاقوں کی طرف جا رہے تھے۔ احسان الحق اور رادھے شام دونوں گہرے دوست بھی اپنے اہل و عیال کے ہمراہ ٹھنڈے علاقوں کی طرف سیر و تفریح کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ سیوانا تھہ کی دکان پہ آج میٹھائیاں خریدنے والوں کی کافی بھیڑ تھی۔ احسان الحق اور رادھے شام بھی میٹھائی خریدنے کے لئے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ کچھو چال چل رہی لوگوں کی قطار دھیرے دھیرے سنسنے لگی۔ سیوانا تھہ اپنے گاہکوں کی لمبی قطار دیکھ کے بہت خوش ہو رہے تھے وہ تو بس گاہکوں سے روپے پکڑ لینے کا کام کر رہے تھے اور نوکر گاہک کو میٹھائی کا ڈبہ پکڑاتے، قطار میں کھڑے کھڑے احسان الحق کی نظر اچانک دکان کے اندر دوڑ پیچھے اُس بڑے ہال میں گھوم گئی جہاں میٹھائیاں تیار کی جاتی تھیں۔ اندر ہال میں بنا سیتی کے کنٹر ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور میٹھائیاں بنانے والے سیوانا تھہ کے کاریگر کالے بھتنے سے نظر آ رہے تھے، لوہے اور المونیم کی بڑی بڑی

پراتوں میں گرم گرم مٹھائی کا رقیق مواد ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا گیا تھا۔ احسان الحق نے اپنے گہرے دوست رادھے شام کو بھی اندر کا منظر دیکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اب یہ دونوں دوست بظاہر قطار میں کھڑے تھے لیکن اُن کی نگاہیں میٹھائیاں تیار ہونے والے اُس بڑے ہال کے اندر کی ہر شے پر گردش کر رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بڑا چوہا کہیں سے آنکلا اور پرات میں پڑی مٹھائی کے اوپر اُچھل کود مچاتے ہوئے ایک جگہ سے کھانے لگا، اُسے دیکھ اور چوہے بھی کہیں سے آگئے اور تمام پراتوں پہ دھما چوکڑی مچانے لگے۔ ایک نوکر نے چوہوں کو بھگایا تو کہیں سے کالے رنگ کی بلی آگئی اور اُس نے پرات میں منہ مارا بلی کو بھگاتے ہوئے دوسرے نوکر کو زور کی چھینک آئی تو اُس کی ساری رینٹ پرات میں گر پڑی۔ احسان الحق نے اپنے دوست رادھے شام سے کہا:

”یار! مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر متلی آ رہی ہے“

رادھے شام نے جواب دیا

”یار میرا بھی یہی حال ہے!“

احسان الحق نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا

”میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُس دکان سے پتیے کا ڈبہ خریدوں لیکن اب میں کچھ

بھی نہیں خریدوں گا۔“

رادھے شام نے کہا

”میرے دل نے چاہا تھا کہ شانہ مرغی کا ڈبہ خریدوں مگر یہ سب کچھ دیکھ کر

میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں بھی یہاں سے کچھ نہیں خریدوں گا۔“

احسان الحق اور رادھے شام دونوں دوست اپنی گاڑیوں کی طرف واپس جانے

لگے تو سیوانا تھ نے انہیں پکارا۔

”آئیے آئیے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ واپس آئیے نا آپ خالی ہاتھ کیوں

جا رہے ہیں“

دونوں دوستوں نے سیوانا تھ کو کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ سیوانا تھ کی نظر جب

دکان کے اندر والے کھلے دروازے پر پڑی تو غصے سے اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا اور تب

انہوں نے اپنے نوکروں کو بڑی کرخت آواز میں ڈانٹتے ہوئے کہا ”ختم میں سے کس نالائق نے اندر کا دروازہ کھلا رکھا تھا کہ بیس برس میں آج پہلی بار میری اس دکان سے دو گاہک خالی ہاتھ واپس گئے ہیں۔ اکثر کہتا رہتا ہوں کہ اندر کا دروازہ ہمیشہ بند رکھا کرو، پھر آج تم سب کی رات کو میٹنگ لیتا ہوں۔“



اندر کی باتیں

(۲۰۱۱ء کے نام)

نریش رانا کا سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ مہانگر کے بالکل وسط میں ہر خاص و عام کو دعوت نکارہ دیتا ہے۔ کھانے پینے اور رہائش کی تمام سہولیات اس میں موجود ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کے لوگ اس میں بڑے شوق سے ٹھہرتے ہیں جبکہ مفلوک الحال طبقے کے لوگ اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک دنیا اس میں آباد رہتی ہے۔ طرح طرح کے ارمان بھرے دلوں کے لوگوں کا اس میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ سات منزلہ یہ عالی شان ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ ہر وقت نئی نویلی دلہن کی طرح سجا رہتا ہے۔ خاص کر رات کے وقت جب بجلی کے قہقروں کی دھنک رنگ روشنی سے پل پل میں پورے ہوٹل کی چاروں سمتوں پر مختلف طرح کے خوشنماؤ بڑاؤ تیار ہوتے چلے جاتے ہیں تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کی ہر چیز نہایت نفیس، دیدہ زیب، آرام دہ اور عمدہ ہے کہ جو اس میں ٹھہرنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اس میں داخل ہونے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اُس کے دل و دماغ سے دنیا کے غموں، اُجھڑوں اور مسائل کا غبار دھل گیا ہو اور جسمانی و روحانی سکون کے تمام دروازے اُس کیلئے کھل گئے ہوں۔ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں کام کرنے والے ہر چھوٹے بڑے تمام ملازم نہایت مہذب، شائستہ اور حلیم ہیں۔ مسافروں کو اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے بیٹھے ہر چیز برقی مٹن دباتے ہی مل جاتی ہے۔

بیرے اپنی خوش اخلاقی، سلیقہ شعاری اور نظم و ضبط سے مسافروں کا دل جیت لیتے ہیں۔ جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ہے وہ نہایت لذیذ اور ملاوٹ کے بغیر دستیاب ہوتی ہیں۔ نریش رانا بذات خود ایک جہاں دیدہ، دور اندیش اور وضع دار شخصیت کے مالک ہیں۔ کروڑ پتی ہیں۔ وہ روپیوں کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ روپے اُن کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اپنے اس عالیشان ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کے باعث انہیں روپے گننے سے فرصت نہیں ملتی۔ سو سو کے نوٹوں سے لے کر ہزار روپے تک کے نوٹوں کی گڈیاں گننے کیلئے اُن کی بیٹھک کے سامنے مشین رہتی ہے۔ اس طرح صبح سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک لاکھوں روپے اُن کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ نریش رانا کے سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کا صدر دروازہ ہر خاص و عام کیلئے کھلا رہتا ہے۔ مگر اس میں وہی لوگ داخل ہوتے ہیں جن کی جیب اکثر گرم رہتی ہے۔ تین طرح کے لوگ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں زیادہ تر ٹھہرتے ہیں۔ ایک وہ مرد عورتیں جو سیر و سیاحت کی غرض سے چند ہفتوں کے لئے اپنے گھروں نکلے ہوتے ہیں وہ ہفتہ دس دن کے لئے اُس ہوٹل میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہیں سرکاری مہمان کے طور پر نریش رانا کے ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں دو یا تین دن کیلئے ٹھہرنے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ تیسرے وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو کبھی کبھار اپنا دل بہلانے اور ذہنی تناؤ دور کرنے کیلئے چند گھنٹوں کی خاطر اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں آتے ہیں۔ نریش رانا اپنے جنرل مینجر سے ہر آنے والے کا نام، پتہ اور ضروری معلومات کا باضابطہ ایک رجسٹر میں اندراج کرواتے ہیں اور اس کے بعد آنے والے کو کمرے کی چابی سونپ دی جاتی ہے۔ نریش رانا اور اُس کا جنرل مینجر مردوں اور عورتوں کے چہرے نہیں پڑھتے اور نہ ہی اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ کس عورت کا کس مرد کے ساتھ یا کس لڑکے کا کس لڑکی کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ چہرے پڑھنا یا جائز و ناجائز رشتوں کی تہہ تک جانا یہ کام تو پولیس اور سی آئی ڈی والوں کا ہے۔ نریش رانا یا اُس کے ملازموں کو اس سے کیا لینا دینا۔

نریش رانا اپنی موڈنگ چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اُن کی نظر کل کانت پر پڑی جو آہستہ آہستہ ہوٹل کے صدر دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ نہایت سست، بے رونق

چہرہ، سر پہ بڑے بڑے بال بکھرے ہوئے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے یہ زندگی سے روٹھ گیا ہو یا زندگی اس سے روٹھ گئی ہو۔ جونہی وہ نریش رانا کے قریب پہنچا تو وہ اپنی مودنگ چیز پر سے ایک دم کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

”ارے کمل کانت! میرے بھائی کیا حال ہے تیرا؟ مجھے تو تو پہلی نظر میں آج پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا“ دونوں بڑے تپاک سے آپس میں ہنسی ہوئے، پھر کمل کانت ایک طرف گری یہ بیٹھ گیا تو نریش رانا نے اُسے پوچھا۔

”کمل کانت! تُو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بھائی! کہاں گیا تیرا وہ ہشاش بشاش چہرہ! آج سے چھ مہینے پہلے جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو تیرا نورانی چہرہ اور سڈول جسم دیکھ کے مجھے تجھ پر رشک آ گیا تھا لیکن آج تیرا حال دیکھ کے میں مایوس ہو رہا ہوں۔ آخر کیا بات ہے؟ میں تیرے وجود میں آئی ہوئی اس سونامی کو جاننا چاہتا ہوں جس نے تیری یہ حالت بنائی ہوئی ہے۔“

کمل کانت ابھی تک بالکل خاموش تھا۔ اُس کی مایوس کن صورت اور مکمل خاموشی سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی مجذوب ہو۔ پھر اُس نے بڑے جذباتی انداز میں اپنی واردات غم بیان کرنا شروع کر دی اُس نے کہا۔

”نریش رانا صاحب! میں آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں اور سمجھتا رہوں گا مجھ پہ جو بیتی ہے وہ کسی پہ نہ بیٹے! اگر آپ میرے رنج و غم سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو میں آپ ہی سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ بالفرض محال اگر آپ کا بیٹا جس کی تکرار دس سال کی رہی آو اُسے دو غنڈے آپ کے گھر سے اٹھا کر لے جائیں اور آپ روتے ہوئے ان غنڈوں کے پیچھے جائیں اور زار و قطار روتے ہوئے انہیں منت سماجت کرنے لگ جائیں کہ میرا بیٹا مجھے واپس دے دو! لیکن آپ کی حالت زار دیکھنے کے باوجود دونوں غنڈے بندوق کی نوک پہ آپ کے دونوں ہاتھ آپ کی پشت پہ مضبوط رتی سے باندھ دیں اور پھر آپ کے بیٹے کے کپڑے اتار لیں، اُس کے بعد آپ کے سامنے اُس کا ایک ایک انگ کاٹنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ آپ کا بیٹا آپ کی نظروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جائے تو رانا صاحب آپ پر کیا گزرے گی! یا ایک اور سانحہ آپ کی ذات سے منسوب کر رہا ہوں، مثال کے طور پر آپ جون

یا جولائی کے مہینے میں ایک تپتے ہوئے ریگستان سے تنہا گزر رہے ہوں اور پیاس کی شدت سے آپ کی زبان منہ سے باہر لٹک رہی ہو کہ اچانک ایک شخص ہنستا مسکراتا آپ کو نظر آجائے اور وہ آپ کو یہ یقین دلائے کہ میں آپ کی رہبری کروں گا بس تھوڑی دُور آگے میرے ساتھ چلیں وہاں پانی سے لبریز ایک کنواں ہے۔ ہم دونوں وہاں پانی پیئیں گے۔ ظاہر ہے آپ کی آدھی پیاس اس شخص کی باتیں سنتے ہی بجھ جائے گی، لیکن جب آپ اُس کنوئیں پر پہنچتے ہیں تو کنواں بالکل خشک ہے اور کنوئیں میں نیچے چھانکتے ہی وہ شخص آپ کو دھکا دے کر کنوئیں میں گرادیتا ہے۔ رانا صاحب! مجھے بتائیے اُس وقت آپ کے دل پہ کیا بیتے گی! بس میرے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا سلسلہ کیا گیا ہے میرے بھائی!“

نزیش رانا نے مکمل کانت کی باتیں سن کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بڑے فکر مند لہجے میں مکمل کانت سے پوچھنے لگے۔

”مکمل کانت! آخر تیرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کھل کے بات کرنا تاکہ مجھے بھی پتا چلے کہ معاملہ کیا ہے؟“ مکمل کانت نے کہا۔

”سینے بھیا! آپ ہی کے کہنے پر میں نے دارالعلوم کے شعبہ تاریخ میں اسٹنٹ پروفیسری کی آسامی کیلئے فارم بھرا تھا لیکن مجھے بُری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میرا مستقبل تاریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ میرے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا حق بُری طرح مجھ سے چھینا گیا ہے۔ چھ ماہ سے میرے دل میں رنج و غم اور بے چینی کی اک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ میرے مستقبل کو تاریک بنانے والا شخص کون ہے؟ میرا حق مجھ سے کس نے چھینا ہے؟“

نزیش رانا نے مکمل کانت کی باتیں سنیں تو چونک اٹھے اور کہنے لگے ”ارے ہاں یہ بات ہے، جانتا ہوں۔ ہاں ہاں سب معلوم ہے میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تو کسی گھریلو مسئلے میں الجھ کے رہ گیا ہو گا تبھی تو اس قدر کمزور اور پریشان حال ہے۔ مکمل کانت! تیرے خلاف بنائی گئی پلاننگ کا مجھے پورا پتا ہے غور سے سن، تیرا حق چھیننے والا شخص شعبہ تاریخ کا سرپرست چترنجن باسو ہے۔ میری اُس سے دوستی تو نہیں البتہ اُس نے مجھے اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ اُس کا اکثر میرے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اپنے دل کی ہر ایک بات مجھے سناتا دیتا

ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سے باتیں وہ اپنی دھرم بتی سے بھی چھپاتا ہے۔ اُسے مجھ پہ پورا اعتماد ہے کہ میں اُس کی ہر ایک بات کو پوشیدہ رکھنے والا ہوں۔ لیکن کمل کانت! تو مجھے نہایت عزیز ہے کیونکہ میں تجھ میں انسانیت کے جوہر اور ذہانت کے موتی دیکھتا ہوں جبکہ چترنجن باسو میری نظر میں بدترین منافق ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ممتحن بن کے کہیں جاتا ہے تو کال گرل بگ کرواتا ہے اور ایسی مدر کی خواہش میں رہتا ہے جس کے پینے سے آدمی کی آنکھیں دن کو ہی تارے گھٹنے لگتی ہیں اور وجود زمیں پر ڈھیر ہونے لگتا ہے۔ کمل کانت سنو! چترنجن باسو بہت چتر آدمی ہے وہ اہم سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات کو قابو کرنے کیلئے مختلفیں منعقد کرتا ہے۔ پچاس روپے کا گلدستہ اُن کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے، ڈیڑھ سو روپے کا شال اُن کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس منافقانہ انداز سے وہ اُن کے روشن ضمیر کی گتھی دبوچ لیتا ہے پھر وہ اُس کی بد اعمالیوں پہ لب کشائی نہیں کر پاتے! لیکن کمل کانت! تجھے میں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ میں تیری وہ نیکی کبھی بھول نہیں سکتا جب تو نے آج سے دس سال پہلے میرے بیٹے زیندر کو جس کی عمر اُس وقت کل پانچ سال کی تھی ایک بریک فیل گاڑی سے بچایا تھا۔ دوست بے وفا ہو سکتا ہے لیکن بھائی کا رشتہ نہایت مضبوط نہ سہی ناپائیدار بھی نہیں ہوتا، تو میرا بھائی ہے کمل کانت! میں یقین سے کہتا ہوں جتنا میں چترنجن باسو کو اندر اور باہر سے جانتا ہوں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔“ کمل کانت سے رہانہ گیا اُس نے پوچھا۔

”رانا صاحب اگر چترنجن باسو کے ساتھ آپ کی اتنی جان پہچان تھی یا اگر وہ آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہے تو میری اُس سے سفارش کرتے آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

نریش رانا نے کہا

”ارے پوری بارت تو اُن لے نا ساری حقیقت تیرے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں چترنجن باسو کو چار چیزیں بہت پیاری ہیں اور ان چیزوں کے حصول کی خاطر وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ چار چیزیں ہیں۔ مدر، دھن، تار، اور چاندو۔ میں اُن لمحات کو تادم حیات نہیں بھول پاؤں گا جب اُس نے مجھے فون پہ کہا تھا۔“

”رانا صاحب! آداب! چترنجن باسو بول رہا ہوں۔ میرے تین مہمان ہوائی

جہاز کے ذریعے ہمارے شہر میں آرہے ہیں۔ تینوں کا قیام اور طعام آپ کے ساتھ ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں ہوگا۔ اس لئے ساتویں منزل پہ تین کمروں کی بکنگ میرے نام پر رکھ لیجئے۔“

میں نے کہا تھا ”کوئی بات نہیں سب ہو جائے گا“

دوسرے دن چترنجن باسو کے تینوں مہمان میرے ہوٹل میں پہنچ گئے تھے۔ میں نے بذات خود انہیں پہلی منزل سے لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پہ پہنچا دیا تھا۔ تین کمروں میں ان کی خدمت کیلئے تین خدمت گار لگا دیئے تھے۔ رات کے تقریباً نو بجے چترنجن باسو اور اس کے ساتھ سانولے سانولے رنگ کا بالکل ایک پتلا سا آدمی ہوٹل میں چلے آئے۔ دونوں ڈرے سہمے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے۔ اُن کے چہروں سے بوکھلاہٹ عیاں ہو رہی تھی۔ چاروں طرف نظریں گھما رہے تھے کہ کوئی انہیں دیکھ نہ لے۔ چترنجن باسو نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا

”رانا صاحب! میں بڑے ہی نازک وقت میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں اپنے مہمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اپنا گہرا دوست سمجھتا ہوں۔ کوئی بھی بات آپ سے نہیں چھپاتا ہوں آپ فوراً مجھے میرے مہمانوں سے ملوائیے۔“ میں نے کہا ”ہاں ہاں ضرور کیوں نہیں۔“

ہم تینوں لفٹ میں سوار ہوئے تو میں نے چترنجن باسو سے پوچھا۔
 ”باسو صاحب! یہ چھو کر اکون ہے؟ اسے آپ کہاں سے لائے ہیں اس کا کوئی اتہ پتہ تو بتائیے؟“

چترنجن باسو کے سیاہ ہونٹوں پہ مسکان سی ابھری اور کہنے لگا
 ”رانا صاحب! یہ اپنا ہی آدمی ہے کوئی پرانا تھوڑی ہے۔“

چند ہی لمحوں میں ہم تینوں لفٹ سے اترے۔ تینوں مہمان الگ الگ کمروں میں بیٹھے تھے۔ تینوں کمرے نمبر دار تھے میں نے سب سے پہلے کمرہ نمبر ۴۳۵ کی تیل بجائی تو اندر سے فوراً ایک خوب صورت اور عظیم و شیم شخصیت نے جونہی دروازہ کھولا تو چترنجن باسو لپک کر آگے بڑھا اور مسرت آمیز لہجے میں بغل گیر ہوتے ہوئے اُس شخص سے کہنے لگا۔

”منوج اگر وال صاحب! آداب سنائیے کیسے رہے؟ کسی کٹھنائی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟ میں آپ کا خادم ہوں۔ دل میں کئی دوسو سے اٹھ رہے تھے کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی ہو، جا کے معلوم کر لوں۔ اس لئے آپ کے پاس اس وقت چلے آیا۔“

منوج اگر وال بولے

”باسو صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کیسی چٹنا! بس سب گشل منگل ہے“

چترنجن باسو نے اپنے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

”اگر وال صاحب! کسی بھی چیز کی آپ کو ضرورت پڑے تو نریش رانا صاحب کو فون پہ بتا دیجئے گا، یہ پل بھر میں سب کچھ آپ کے سامنے پیش کروادیں گے۔ رانا صاحب اور میں ایک ہی وجود کے دو روپ ہیں۔“

منوج اگر وال نے مسکراتے ہوئے کہا

”بہت اچھا رانا صاحب“

چترنجن باسو نے موقع غنیمت جانا اور اپنے اصلی مدعا یہ آیا، کہنے لگا

”اگر وال صاحب آپ کو معلوم ہی ہے کل پورے دس بجے دائر العلوم کے سرپرست اعلیٰ کے آفس میں شعبہ تاریخ کی اسٹنٹ پروفیسری کے لئے انٹرویو شروع ہو رہا ہے۔ آپ اُس میں بحیثیت ماہر تاریخ موجود ہونگے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ یہ نوجوان اسے سر سے پیر تک دیکھ لیجئے اس کا نام خیالورام ہے۔ اس کا انتخاب ہونا چاہیے۔ یہ ہسٹری میں ایم فل پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہے۔ نہایت شریف، دیانتدار اور محنتی ہے۔ اس لئے آپ نے اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھنا ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام، شادی شدہ ہو، یا غیر شادی شدہ اور پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔ بڑی مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس پہنچا ہوں میری آپ سے یہ بھی گزارش ہے کہ مکمل کانت نام کا ایک اور امیدوار کافی بھرتیاں مارتا ہے۔ اُس کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ میری تمام پلاننگ خاک میں مل جائے گی“

منوج اگر وال ایک ماہر تاریخ کی حیثیت سے کئی انٹرویوز میں ایک حق وانصاف

پرست کے طور پر شرکت کر چکے تھے۔ عدل و انصاف کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے چترنجن باسو کی باتیں سنیں تو اُن کے چہرے پہ رنجیدگی کے آثار اُبھر آئے۔ انہوں نے کہا۔

”باسو صاحب! مکمل کانت نے اگر فارم بھرا ہے تو اُس کی سلیکشن کی جانی چاہیے۔ وہ ایک مستحق امیدوار ہے۔ مکمل کانت کو ہم تیس برس سے ہسٹری کے اہم اور معیاری رسائل میں پڑھتے آرہے ہیں۔ مکمل کانت نے ہندوستان کی جدید تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی سے نہیں ہو سکا ہے۔ لہذا یہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہے بلکہ ایک بڑا ظلم ہے کہ حق والے کو اُس کا حق نہ دلا یا جائے۔“

چترنجن باسو کے چہرے پر جو رونق تھی وہ منوج اگروال کی باتیں سن کر فوراً غائب ہو گئی ادھر خیاں اور ام کا منہ بھی ٹھوکر رہا تھا۔ چترنجن باسو منت سماجت پر اُتر آیا اُس نے منوج اگروال کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

”اگروال صاحب! اک بار میرا کہا مان لیجئے۔ میری لاج رکھ لیجئے۔ مکمل کانت کا ہم سب آگے ضرور خیال رکھیں گے“ چترنجن باسو نے ٹھوڑی سے ہاتھ اٹھایا تو اگروال کے پاؤں پکڑ لیے منوج اگروال نے بادل نا خواستہ کہہ دیا۔

”اچھا دیکھ لیتے ہیں“

چترنجن باسو کے حواس بحال ہوئے۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رخصت لے کر ہم تینوں آدمی منوج اگروال کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے دوسرے مہمان کے کمرہ نمبر ۴۳۶ کی تیل بجائی تو اندر سے ایک بارعب شخص نے دروازہ کھولا۔ اُسے دیکھتے ہی چترنجن باسو فوراً آگے بڑھا اور اُس سے پلٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”کلمدپ سنگھ جی! کیا حال ہے؟ کیسے رہے کسی طرح کی کوئی پریشانی تو نہیں آئی“

کلمدپ سنگھ بولے ”باسو صاحب! ابھی تک تو سب اچھا ہے آگے کیا پتا، سب اوپر والے کا کرم ہے، آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی بھی پریشانی نہیں ہو سکتی ہے ابھی ہم نے کھانا وغیرہ کھا لیا ہے۔ بس آرام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔“

چترنجن باسو نے کہا

”آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ آرام کیجئے بہر حال چند اہم باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ نے یہاں بحیثیت ماہر تاریخ اسٹنٹ پروفیسری کے انٹرویو کیلئے بلایا ہے۔ لہذا آپ سے مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرا بھرپور ساتھ دیں گے، میری مراد اس شخص کی سلیکشن سے ہے“ چترنجن باسو نے اپنی میزبانی انگلی سے خیالورام کی طرف اشارہ کیا، پھر اُس نے کہا

”اس انٹرویو میں مکمل کانت نام کا ایک اور امیدوار انٹرویو دینے آرہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اُس کی سلیکشن نہ ہو، اُس کے بدلے میں اپنے خیالورام کو آگے لانا چاہتا ہوں۔ لہذا خیالورام کا خیال رکھئے“ چترنجن باسو کی باتیں سن کر کلدیپ سنگھ تملنا اٹھے، انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی پتھو نے اُن کی چھاتی پہ ڈنک مارا ہو وہ کہنے لگے۔

”باسو صاحب! مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی کہ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا مزاج رکھتے ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی کہنے پر مجبور کریں گے۔ میں جہاں کہیں بھی آج تک سلیکشن کمیٹی میں گیا ہوں میں نے حقدار کو اُس کا حق دلایا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ خیالورام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور مکمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اُس پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مکمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاریخ کے دقیق موضوعات پہ اُس کی تحقیق نے نئی جہات مرتب کی ہیں۔ اُس کی زبان اس کے موضوعات اور اُس کی علمی بصیرت کا باسو صاحب میں بہت قائل ہوں۔ یہ وہی مکمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کینڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد و تحسین وصول کرتے ہیں“

چترنجن باسو نے فوراً کلدیپ سنگھ کے پیر پکڑ لئے اور کہنے لگا۔

”آپ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ خیالورام کا ہم سب نے اس لئے خیال

رکھنا ہے کیونکہ یہ نہایت مفلس ہے اور اس میں خدمت کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے۔“

کلدیپ سنگھ نے کچھ توقف کے بعد مجبوراً کہا ”بھگوان یہ بھروسہ رکھیں۔“

چترنجن باسو نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور

پرست کے طور پر شرکت کر چکے تھے۔ عدل و انصاف کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے چترنجن باسو کی باتیں سنیں تو اُن کے چہرے پہ رنجیدگی کے آثار اُبھر آئے۔ انہوں نے کہا۔

”باسو صاحب! مکمل کانت نے اگر فارم بھرا ہے تو اُس کی سلیکشن کی جانی چاہیے۔ وہ ایک مستحق امیدوار ہے۔ مکمل کانت کو ہم تیس برس سے ہسٹری کے اہم اور معیاری رسائل میں پڑھتے آرہے ہیں۔ مکمل کانت نے ہندوستان کی جدید تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی سے نہیں ہو سکا ہے۔ لہذا یہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہے بلکہ ایک بڑا ظلم ہے کہ حق والے کو اُس کا حق نہ دلا یا جائے۔“

چترنجن باسو کے چہرے پر جو رونق تھی وہ منوج اگروال کی باتیں سن کر فوراً غائب ہو گئی ادھر خیا لورام کا منہ بھی ٹوٹ کر رہا تھا۔ چترنجن باسو منت سماجت پر اتر آیا اُس نے منوج اگروال کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

”اگروال صاحب! اک بار میرا کہا مان لیجئے۔ میری لاج رکھ لیجئے۔ مکمل کانت کا ہم سب آگے ضرور خیال رکھیں گے“ چترنجن باسو نے ٹھوڑی سے ہاتھ اٹھایا تو اگروال کے پاؤں پکڑ لیے منوج اگروال نے بادل نا خواستہ کہہ دیا۔

”اچھا دیکھ لیتے ہیں“

چترنجن باسو کے حواس بحال ہوئے۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رخصت لے کر ہم تنیوں آدمی منوج اگروال کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے دوسرے مہمان کے کمرہ نمبر ۴۳۶ کی تیل بجائی تو اندر سے ایک بارعب شخص نے دروازہ کھولا۔ اُسے دیکھتے ہی چترنجن باسو فوراً آگے بڑھا اور اُس سے پلٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”کلدیپ سنگھ جی! کیا حال ہے؟ کیسے رہے کسی طرح کی کوئی پریشانی تو نہیں آئی“

کلدیپ سنگھ بولے ”باسو صاحب! ابھی تک تو سب اچھا ہے آگے کیا پتا، سب ادھر والے کا کرم ہے، آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی بھی پریشانی نہیں ہو سکتی ہے ابھی ہم نے کھانا وغیرہ کھالیا ہے۔ بس آرام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔“

چترنجن باسو نے کہا

”آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ آرام کیجئے بہر حال چند اہم باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ نے یہاں بحیثیت ماہر تاریخ اسٹنٹ پروفیسری کے انٹرویو کیلئے بلایا ہے۔ لہذا آپ سے مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرا بھرپور ساتھ دینگے، میری مراد اس شخص کی سلیکشن سے ہے، ”چترنجن باسو نے اپنی میزبانی انگلی سے خیالورام کی طرف اشارہ کیا، پھر اُس نے کہا

”اس انٹرویو میں مکمل کانت نام کا ایک اور امیدوار انٹرویو دینے آرہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اُس کی سلیکشن نہ ہو، اُس کے بدلے میں اپنے خیالورام کو آگے لانا چاہتا ہوں۔ لہذا خیالورام کا خیال رکھئے“ چترنجن باسو کی باتیں سن کر کلدیپ سنگھ تھکلا اٹھے، انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی پتھو نے اُن کی چھاتی پہ ڈنک مارا ہو وہ کہنے لگے۔

”باسو صاحب! مجھے آپ سے یہ امید تھی کہ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا مزاج رکھتے ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی کہنے پر مجبور کریں گے۔ میں جہاں کہیں بھی آج تک سلیکشن کمیٹی میں گیا ہوں میں نے ہتھار کو اُس کا حق دلایا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ خیالورام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور مکمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اُس پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مکمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاریخ کے دقیق موضوعات پہ اُس کی تحقیق نے نئی جہات مرتب کی ہیں۔ اُس کی زبان اس کے موضوعات اور اُس کی علمی بصیرت کا باسو صاحب میں بہت قائل ہوں۔ یہ وہی مکمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کینڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، البونیا، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد و تحسین وصول کرتے ہیں“

چترنجن باسو نے فوراً کلدیپ سنگھ کے پیر پکڑ لئے اور کہنے لگا۔

”آپ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ خیالورام کا ہم سب نے اس لئے خیال

رکھنا ہے کیونکہ یہ نہایت مفلس ہے اور اس میں خدمت کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے۔“

کلدیپ سنگھ نے کچھ توقف کے بعد مجبوراً کہا ”بھگوان پہ بھروسہ رکھیں۔“

چترنجن باسو نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور

زخمت لے کر ہم تینوں کمرے سے باہر آئے۔ اب ہم کمرہ نمبر ۴۳ کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے آہستہ سے بیل کے بٹن پہ انگلی دبا دی اندر کمرے میں ایک سریلی آواز گونج اٹھی اندر سے ایک عمر رسیدہ شخص نے دروازہ کھولا۔ انہیں دیکھ کے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ عمر رفتہ کو آواز دے رہے ہوں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”سنائیے قبلہ کیسے آنا ہوا؟“

میں نے کہا ”چترنجن باسو آپ سے ملنے آئے ہیں، آپ اُن کے مہمان ہیں“ تب تک چترنجن باسو فوراً آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

”کندن لال جی! آداب! سنائیے کیسے ہیں؟ فون پہ تو آپ سے بات ہوئی تھی مگر آپ کو دیکھنے کی چاہت مجھے اس وقت یہاں لے آئی۔ آپ سے میری ملاقات پہلی بار ہو رہی ہے“

کندن لال نے کہا

”اچھا آپ چترنجن باسو ہیں!“

”جی ہاں میں ہی چترنجن باسو ہوں“

کندن لال نے ڈوبتی اُبھرتی آواز میں کہا ”ارے بھائی! ابھی تو تم جوان ہو۔ ہمارے دن تو بیت گئے۔ بس آپ کے یہاں سے ہمیں بلا لیتے ہیں تو ہم بھی چلے آتے ہیں“ چترنجن باسو نے کہا

”کندن لال جی! میرے لائق کوئی سیوا ہو تو کہیے“

”ارے بھائی! ہم کیا بتائیں۔ ہمیں تو آپ کی سیوا کیلئے بھیجا گیا ہے“

کندن لال کی زبانی اُن کا یہ جملہ سُن کر چترنجن باسو کی جان میں جان آگئی تب اُس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اُس نے کہا

”کندن لال جی! بھگوان آپ کی عمر لمبی کرے! بہت تعریفیں آپ کے بارے میں سُن چکا ہوں۔ بس میری آپ سے ایک التجا ہے وہ یہ کہ آپ دیکھ رہے ہیں میرے ساتھ یہ دُہلا پتلا سانولے رنگ کا جوان کھڑا ہے، اسے خیالورام کہتے ہیں۔ کل اس کا انٹرویو ہے، آپ ہی جیسے بھگوان کے پیارے انٹرویو لے رہے ہیں۔ میری تڑپ اور آرزو یہ ہے کہ

خیالورام کی سلیکشن ہو اور کل کانت نام کا ایک اور امیدوار امید لگائے بیٹھا ہے۔ اُس کی سلیکشن نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اندر ہی اندر اُس کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ لہذا اس بات کا خیال رکھیں۔ میری رائے یہ ہے کہ خیالورام سے آپ کل انٹرویو میں جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں وہ سب اسے ابھی بتا دیجئے اور کوشش کیجئے کہ اس کا نام، تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور زیادہ سے زیادہ اگر پوچھنا بھی چاہیں تو یہ پوچھئے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع کیا تھا اور اگر موضوع کے اندر آپ اسے گھسادیں گے تو اس کم زبان کی زبان لڑکھڑائی جائے گی۔ لہذا اس پر رحم کیجئے۔ دوسری بات یہ کہ کل کانت سے ایسے ایسے سوالات پوچھئے گا کہ بچہ کو تانی یاد آئے اور اُس کا دماغ چکرانے لگ جائے۔

کندن لال نے زور سے قہقہہ مارا اور کہنے لگے ”چترنجن باسو صاحب! آپ خوش رہیے میں آپ کی تمنا پوری کروں گا۔ آپ ہمارا بھی خیال رکھیے۔ خیالورام کا خیال میں رکھوں گا۔ اُس کی سلیکشن کروا کے نہ گیا تو میرا نام بھی کندن لال نہیں۔ رہی بات کل کانت کی تو اُس کی فکر چھوڑ دیں۔ اُس سے میں وہ سوالات پوچھوں گا کہ جن کے جوابات اُس کے فرشتے بھی نہیں دے پائیں گے۔ ظاہر ہے آپ بھی انٹرویو کمپٹی میں موجود ہوں گے سب کچھ اپنی آنکھوں دیکھ لیں گے۔“

چترنجن باسو اور خیالورام کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔ کندن لال سے انہیں ایسی اُمید نہ تھی مگر وہ تو واقعی کندن نکلے۔ چترنجن باسو نے خوشی کے جوش میں کندن لال کو گلے سے لگایا۔ خوب بھیچا اور کہنے لگا۔

”کندن جی! آپ سدا سکھی رہیں!“ یہ کہتے ہوئے چترنجن باسو اور خیالورام نے ہاتھ جوڑے اور رخصت ہونے لگے تو کندن لال نے خیالورام کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہنے لگے۔

”جاؤ بیٹا! کل دیکھا جائے گا تم خوش رہو۔“

ہم تینوں کمرے سے باہر آئے تو میں نے چترنجن باسو کو خیالورام سے الگ لے جا کر تنہائی میں اپنی جگہ پوچھا ”باسو صاحب! آپ اس خیالورام کے لئے کیوں اتنا تڑپ رہے ہیں، وجہ کیا ہے؟ میں تو حیران رہ گیا! یہ چکر کیا ہے؟“

چترنجن باسو نے بڑے اطمینان سے کہا

”نریش رانا صاحب! میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیر نے تک کون سا ایسا کام ہے جو خیالورام نے نہیں کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے میں اس کا خیال نہ رکھوں تو کس کا رکھوں؟ اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے، بلکہ اس نے تو اپنی جمع پونجی بھی میرے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کرادی ہے۔ اب آپ ہی کہیے کیسے انکار کروں؟“

میں نے پوچھا کتنی جمع پونجی؟ چترنجن باسو نے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں میرے سامنے کھڑی کر دیں اور کہنے لگا۔

”رانا صاحب! آپ سے کوئی بھی بات چھپانا مہاپاپ سمجھتا ہوں“

جب میں چترنجن باسو کی باتیں سن کر ہکا بکا رہ گیا تو اُس نے کہا

”اچھا رانا صاحب! اب ہم چلتے ہیں آپ کو ہم نے کافی تکلیف پہنچائی معاف کیجئے گا۔“ یہ کہتے ہوئے چترنجن باسو اور خیالورام میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مکمل کانت اس کے بعد۔۔۔ تیرا انٹرویو کیسا ہوا تھا۔ وہ میں تجھ سے سنا چاہتا ہوں۔“

”رانا صاحب! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں تعلیمی اعتبار سے اس وقت بھی اول نمبر پر ہوں۔ میں ایم اے ہسٹری۔ بی ایڈ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نیٹ اور ڈی۔ ایچ یعنی ڈاکٹر آف ہسٹری بھی ہوں۔ اس کے علاوہ بارہ کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ سینکڑوں تاریخی مضامین ملک اور بیرون ملک کے اہم تاریخی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جنہیں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں نے کافی پسند کیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے انٹرویو کی ڈراما بازی میں کیا پوچھا گیا وہ سینے:

میں تین مہینے سے مسلسل انٹرویو کی تیاری کرتا رہا۔ میری آنکھوں کی مینائی لکھتے پڑھتے کمزور ہو گئی۔ ہندوستانی تاریخ کی بہت سے کتابوں کو میں نے پڑھ ڈالا تھا اور جس دن میرا انٹرویو تھا اُس دن جولائی کی ۲۳ تاریخ تھی۔ گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے آفس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑے ہال میں بہت سے امیدوار اونچی نرم کرسیوں پر بیٹھے خوف و امید کے درمیان جھول رہے تھے اور جونہی دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے کمرے سے کوئی امیدوار انٹرویو دے کے آتا تو بقیہ

امیدوار اس کے ارد گرد ایسے جمع ہو جاتے کہ جیسے وہ چار دھام کر کے آیا ہو۔ سب باری باری اُسے پوچھتے ”سنائیے آپ سے کیا پوچھا گیا؟“ وہ اپنا حال بیان کرتا۔ کچھ کوتلی ملتی کچھ حیران رہ جاتے۔ رانا صاحب! جب میرا نمبر آیا تو اپنے ضروری دستاویزات تو میں نے خود اٹھائے لیکن کتابیں اور رسائل اٹھانے کیلئے میں نے دو آدمیوں کی مدد مانگی۔ میرے ساتھ دو چڑاسیوں کو بھیجا گیا، جنہوں نے بڑی مشکل سے میری تصنیف کردہ تاریخی کتابیں اور میرے درجنوں وہ تاریخی رسائل و جرائد اٹھائے جن میں میرے تاریخی مضامین شائع ہوئے تھے۔ میں نے دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے کمرے میں بھگوان کا نام لے کر قدم رکھا تو اندر تقریباً تیرہ آدمیوں کی ایک ٹیم میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے آداب کا پاس و لحاظ رکھا اور سامنے پڑی ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ سب کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چترنجن باسو بھی میرے پرسکون چہرے کو دیکھ کے نہایت متفکر بیٹھا تھا مجھے میرے انٹرویو لینے والے ماہرین تاریخ کی طرف رخ کرنے کر کہا گیا۔ تین آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں دو ادیبز عمر کے تھے، دونوں کے چہروں پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تیسرا آدمی بوڑھا تھا۔ عمر میرا خیال ہے اتنی برس کے آس پاس کی معلوم ہو رہی تھی۔ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ اسی ایک شخص نے مجھے کل چار سوال پوچھے جن کا میرے مضمون اور موضوع سے کوئی بھی تعلق نہ تھا۔

پہلا سوال۔ ”ڈاکٹر کمل کانت میرا پہلا سوال آپ سے یہ ہے کہ حضرت نوح کی کشتی کا سائز کیا تھا یعنی اُس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کتنی تھی؟“
یہ تو میں جانتا تھا کہ حضرت نوح نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو خدا کا تعارف کروایا اور جب قوم باغی و سرکش ہو گئی تو بحکم خدا حضرت نوح نے کشتی تیار کروائی جس میں ہر جاندار کا جوڑا سوار ہوا باقی جو سوار نہیں ہوئے اُن کو خدا نے غرقاب کر دیا لیکن نوح کی کشتی کا سائز! میں نے خاموشی اختیار کی، مجھ سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔
دوسرا سوال۔ ”ڈاکٹر کمل کانت آپ پہلے سوال کا جواب نہیں دے پائے ہیں۔

میرا دوسرا سوال آپ سے یہ ہے کہ دنیا میں پہلے مرنے والی یا انڈیا؟“
میں نے دل ہی دل میں سوچا آخر یہ شخص مجھے اس طرح کے سوالات پوچھ کے

کیوں پریشان کر رہا ہے! میں خاموش رہا۔ لمحہ بھر تک مرغی اور انڈا ایک ساتھ میرے ذہن میں گردش کرتے رہے!

تیسرا سوال۔ ”ڈاکٹر مکمل کانت یہ بتائیے کہ شاہجہاں اور ممتاز بیگم کی قبروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟“

یہ تو میرے علم میں تھا کہ تاج محل دنیا کے عجائبات میں سے ایک بہترین عجوبہ ہے اور شاہجہاں نے اسے اپنی بیگم ممتاز کی فرمائش پہ تعمیر کروایا تھا جو یادگار محبت کا ایک عظیم شاہکار ہے لیکن شاہجہاں اور ممتاز بیگم کی قبروں کے درمیان فاصلہ! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ میں جواب نہیں دے سکا!

چوتھا سوال۔ ”ڈاکٹر مکمل کانت! ابھی تک آپ میرے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے پائے ہیں اب آپ سے میرا آخری سوال یہ ہے کہ حشرات الارض میں کون سا کیڑا سب سے پہلے گرمی کے موسم میں زمین کے اندر سے باہر آتا ہے اور کون سا کیڑا سردی کے موسم میں سب سے پہلے زمین کے اندر چلا جاتا ہے؟“

میرے دل میں جب غم و غصے کی ایک لہری اٹھی تو میں نے اُس بوڑھے ماہر تاریخ کو کہہ دیا ”جناب میری معلومات کیلئے آپ ہی مجھے ان سوالوں کے جوابات بتا دیجئے۔“ اُس کے بوڑھے چہرے پر ندامت کی ایک شکن سی ابھری اور کہنے لگا ”اگر میں نے ان سوالوں کے جوابات دینے ہوتے تو ڈاکٹر مکمل کانت! تمہیں یہاں آنے کی زحمت کیوں دی جاتی“

رانا صاحب! جب میرے بدن کا ایک ایک انگ کاٹا جا رہا تھا تو میرے لہو لبان وجود کو دیکھ کے چترنجن باسونس رہا تھا۔ پھر دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ نے کہا ڈاکٹر مکمل کانت! اب آپ چلے جائیے گا۔ میں نے اپنا مجروح وجود کو سمینا اور جونہی میں اپنی کتابیں اور رسائل یکجا کرنے لگا تو چترنجن باسونے کہہ دیا۔ ”کتابوں میں کیا رکھا ہوتا ہے؟ اُمیدوار انٹرویو میں بولنا چاہیے۔“ اُس کا یہ جملہ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کر گیا۔ مزید یہ کہ میرے بعد اب خیالورام کی باری تھی۔ اُس کے پاس اپنے کھوکھلے وجود کے سوا یہ تمام چیزیں نہیں تھیں لہذا اُسے تحفظ فراہم کرنے کے لئے چترنجن باسوراہ ہموار کر رہا تھا۔ اس

طرح کتاب کی عظمت، اہمیت و افادیت اور مصنف کا راتوں کی نیند حرام کر کے اپنا لہو جلانے کو کارلوفران تصور کیا گیا! رانا صاحب! انٹرویو والے دن ہی تقریباً رات کے قریب آٹھ بجے خیالورام کا نام اسسٹنٹ پروفیسری کے لئے ہوا میں گردش کرنے لگا اور پھر کچھ ہی دن کے بعد خیالورام نے شعبہ تاریخ میں اسسٹنٹ پروفیسری کی پوسٹ پہ جوائن کر لیا تھا! یعنی چترنجن باسوا اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تھا!

”رانا صاحب! آپ میری باتیں سن رہے ہیں نا؟“

”ہاں مکمل کانت! سن رہا ہوں“

”رانا صاحب! زندگی میں پہلی بار میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی کہ ہم پیالہ وہم نوالہ والوں کی دوستی فولاد کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ باقی تمام دوستیاں یہاں تک کہ قریبی رشتے بھی اُس غبارے کی مانند ہوتے ہیں جس میں ہوا بھری ہو اور ہاتھ پھیرنے پر اُس سے تفتہ ہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے لیکن جو نبی اُسے معمولی سا کیل یا کانٹا چھتا ہے تو پھٹس کر کے اپنی موت کا اعلان کر دیتا ہے۔“

نریش رانا نے استدلالی انداز میں مکمل کانت کو سمجھایا۔

”مکمل کانت! جب دُکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکلی مفت

میں نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی! تجھے پتا ہونا چاہیے دو لاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے! اچھا یہ بتا کہ دارالعلوم کا سرپرست اعلیٰ بھی تجھے تیرا حق نہیں دلا سکا؟ کہتے ہیں کہ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے؟“

مکمل کانت نے جواب دیا

”رانا صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت

ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو چھوٹے ملازموں سے لے کر بڑے ملازموں تک سب سے رات بھر کھڑے کھڑے کام لے سکتا ہے اور چاہے تو دن کو انہیں آرام کروا سکتا ہے۔ دارالعلوم کے کسی انٹرویو میں اگر وہ اڑ جائے تو مستحق امیدوار کو حق دلانے بغیر نہیں

ہے؟“ مکمل کانت! آتک وادی گروپ میں شامل ہونے کی تیری عمر نہیں رہی ہے اور پھر آتک وادیوں کا حال بھی تیرے سامنے ہے!“

”رانا صاحب! اگر آپ یہ بھی نہیں چاہتے ہیں تو پھر میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی تمام کتابیں اور رسائل کہ جو میرا عمر بھر کا اثاثہ ہے، کسی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں پھینک آؤں؟ تاکہ آئندہ مجھے کسی دارالعلوم کے انٹرویو کیلئے یہ منوں بوجھ اپنے کندھوں پہ نہ اٹھانا پڑے۔“

نریش رانا کا ماتھا مکمل کانت کی ناگوار باتیں سن کر شکن آلود ہو گیا، انہوں نے شیک کر کہا ”مکمل کانت! تُو مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہا ہے! ان کتابوں کا کیا تصور ہے؟ ان کتابوں کے ذریعے تو تُو لاکھوں بلکہ کروڑوں دلوں کے اندر اپنی عظمت اور وقار قائم کر چکا ہے اور کیا تو یہ نہیں جانتا ہے کہ قلم کار قوم کی امانت ہوتا ہے۔ ان تمام فتنہ پرور باتوں کو اپنے ذہن سے نکال دے۔“

آخر کار مکمل کانت نے اپنی بے بسی اور مجبوری سے مغلوب ہو کر باواز بلند پوچھا۔ ”تو رانا صاحب! پھر کیا کروں۔۔۔ کہاں جاؤں؟ میرے دل کی بے قراری تو مسلسل بڑھتی جا رہی ہے! مجھے کوئی بہترین مشورہ تو دیجئے۔“

نریش رانا نے مسرت آمیز لہجے میں کہا ”مکمل کانت! تو بے غم رہ میں تجھے ایک بہترین مشورہ دے رہا ہوں جس پہ عمل کرنے سے تجھے اطمینان قلب نصیب ہوگا۔ تجھے نہ تو آتم تپا کرنی ہے، نہ آتک وادی گروپ میں شامل ہونا ہے اور نہ ہی اپنی کتابیں اور رسائل دریا میں پھینکنے ہیں بلکہ میں تجھے اتنا آسان، موثر اور مفید مشورہ دے رہا ہوں کہ تو بھی کیا یاد کرے گا“

نریش رانا کی باتیں سن کر مکمل کانت کے مرجھائے ہوئے دل کی تمام کلیاں مکمل اٹھیں، چہرے پہ نکھار سا آ گیا۔ اُس نے بڑی بے مبری سے پوچھا ”رانا صاحب! آپ کا وہ بہترین مشورہ ہے کیا؟“

نریش رانا نے کہا ”مکمل کانت! میرا وہ بہترین مشورہ یہ ہے کہ تُو پر ماتا کے آگے ہاتھ اٹھا دے

کیونکہ ایک روز یہاں پڑوس کی جامع مسجد میں مولوی اکبر علی جمعہ کے دن لوگوں کے بھاری مجمع میں کہہ رہے تھے کہ تین آدمیوں کی دعا خدا رد نہیں کرتا، ایک عادل بادشاہ کی، دوسرے اُس شخص کی جو راہِ خدا میں ہو اور تیسرے مظلوم کی۔

کمل کانت تیرا حق تجھ سے چھینا گیا ہے! اس لئے تو مظلوم ہے۔“

کمل کانت پوری بات سمجھ گیا، اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے کہا رانا صاحب! آپ نے واقعی مجھے بہترین مشورہ دیا بلکہ ایک طرح کی خوش خبری سنائی، میں زندگی کے آخری لمحے تک اس بہترین مشورہ پر عمل پیرا رہوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!“

نریش رانا نے ٹیل ٹیل بھائی اور خادم فوراً اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے اُسے جوں دو گلاسوں میں لانے کو کہا۔ کچھ ہی لمحوں میں خادم جوں لے کر آگیا۔ نریش رانا نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کمل کانت کو کہا

”میرے بھائی! جوں پی لے اور زندگی میں خوش رہنا سیکھ لے“

”جی رانا صاحب! آپ بجا فرما رہے ہیں ایسا ہی کروں گا“

جوں پینے کے بعد نریش رانا اور کمل کانت آپس میں بغل گیر ہوئے اور کمل کانت نریش رانا سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

”رانا صاحب! بھگوان کرے ہمارا یہ بھائی کمال کا سارشتہ سدا قائم و دائم رہے!“ کمل کانت بہت خوش تھا اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کے دل و دماغ پر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔

جب کمل کانت اپنے گھر پر پہنچا تو اُس نے ایک مخصوص وقت میں ایکس (۲۱) دن تک جاپ کیا، ایک وقت کا کھانا کھایا۔ گھر کے گوشہ تنہائی میں نہ جانے وہ بھگوان سے کیا کچھ مانگتا رہا۔ بالآخر اُس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو بھگوان کے دربار میں شرف قبولیت حاصل ہو گیا۔ ادھر کمل کانت کا جاپ پورا ہوا، ادھر چترنجن باسو کے ہاتھوں اور بیروں میں بے حسی پیدا ہو گئی جو مسلسل بڑھتی چلی گئی اور پھر جب وہ شہر کے مشہور ماہر امراض ڈاکٹر یوگیشور کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اُسے بڑے دکھی لہجے میں کہا

”باسو صاحب! آپ کے جسم میں کوڑھ کی بیماری نے ڈیرہ ڈال دیا ہے!“



ممتاز ادیب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک نظر میں

ڈاکٹر دلجیت ورما پروفیسر (اردو)

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین گاندھی نگر جموں (توی)

موبائل نمبر: 09419150556

- 1۔ نام: مشتاق احمد وانی
- 2۔ والد کا نام: محمد اسد اللہ وانی (مرحوم)
- 3۔ والدہ کا نام: مہتاب بیگم (مرحومہ)
- 4۔ جائے پیدائش: محلہ سردوال۔ گاؤں بہوتہ، علاقہ۔ مرمت، تحصیل و ضلع ڈوڈہ۔ ریاست۔ جموں کشمیر (ہندوستان)
- 5۔ اصل تاریخ پیدائش: 3 مارچ 1963ء اسکول ریکارڈ کے مطابق 3 مارچ 1960ء
- 6۔ تعلیم کا آغاز: سینٹرل اسکول بہوتہ سے ہوا۔
- 7۔ میٹرک کا امتحان: 1980ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا (مرمت) سے پاس کیا۔
- 8۔ بی۔ اے کا امتحان: گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ (ضلع ڈوڈہ) سے 1985ء میں پاس کیا۔
- 9۔ ایم۔ اے (اردو): جموں یونیورسٹی جموں (توی) سے 1988ء میں۔
- 10۔ پی۔ ایچ۔ ڈی: 1999ء میں جموں یونیورسٹی سے۔ محترم عالی جناب گریش چندر سکسینہ گورنر ریاست جموں کشمیر کے ہاتھوں تفویض کی گئی۔
- 11۔ NET: 2001ء میں جموں یونیورسٹی کے تحت۔
- 12۔ بی ایڈ: 2003ء میں جموں یونیورسٹی کے تحت۔

- 13- ڈی لٹ 2012ء میں روجیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (یو پی) سے محترم عالی جناب بی ایل جوشی گورنر (یو پی) محترم جناب محمد مزل وائس چانسلر اور محترم جناب نرندر یادو پلاننگ کیشنز آف انڈیا کے ہاتھوں تفویض کی گئی۔
- 14- پی ایچ ڈی کا موضوع: تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران۔
- 15- ڈی لٹ کا موضوع: اردو ادب میں تانیثیت۔
- 16- ادبی زندگی کا آغاز: 1989ء میں ”افسانہ تڑپتے پنچھی“ سے ہوا۔

تصانیف

- 1- ہزاروں غم (افسانے) 2001ء میں جے کے آفسیٹ پریس دہلی سے شائع ہوئی۔
- 2- تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران (تحقیق و تنقید) 2002ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی۔
- 3- آئینہ در آئینہ (تحقیقی و تنقیدی مضامین) 2004ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی۔
- 4- میٹھا زہر (افسانے) 2008ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی۔
- 5- اعتبار و معیار (تحقیقی و تنقیدی مضامین) 2011ء میں ایچ ایس۔ آفسیٹ دہلی نے چھاپی۔
- 6- اردو ادب میں تانیثیت (تحقیق و تنقید) 2013ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی۔
- 7- شعور بصیرت (تحقیقی و تنقیدی مضامین) 2014ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی۔
- 8- اندر کی باتیں (افسانے) 2015ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی کے ذریعے بہت جلد پریس میں جاری ہے۔

غیر مطبوعہ تصانیف

- 1- افہام و تفہیم زبان و ادب (تحقیقی و تنقیدی مضامین)

- 2- خاورستان کا مسافر (خودنوشت سوانح عمری)
3- تناظرات و تفکرات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)

اعزازات

- 1- افسانہ کلب ملیہ کوئٹہ (پنجاب) کی جانب سے 2010ء میں بہترین افسانہ نگار ایوارڈ
- 2- 2011ء میں جموں یونیورسٹی جموں تو ہی نے مشتاق احمد دوانی بحیثیت افسانہ نگار موضوع پر شکتی دیوی کو ایم فل کی ڈگری تفویض کی۔
- 3- ستمبر 2012ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج کشتواڑ میں کالج کے پرنسپل محترم جناب ڈاکٹر شفقت رفیقی صاحب اور ڈاکٹر طارق جمکین کشتواڑی کی جانب سے منعقدہ ایک ادبی مجلس میں ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور ”جسم خور کیزا کہانی“ پڑھ کر سنائی۔
- 4- 2013ء میں انگریزی کے معروف مبصر محترم جناب ڈاکٹر لالت گپتا نے جموں کشمیر کے معیاری اور مشہور انگریزی روز نامہ "Daily excelsior" میں ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کی تاریخ ساز کتاب "Feminism in urdu Literature" پر ایک بصیرت افروز تبصرہ شائع کر دیا۔
- 5- 16 دسمبر 2013 کو عزت مآب جناب این این وہرا گورنر ریاست جموں کشمیر نے اپنے راج دربار میں ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کی معرکتہ الآرا کتاب ”اردو ادب میں تانیثیت“ کی رسم رونمائی انجام دی۔
- 6- 15 اور 16 مارچ 2014ء کو ملیہ کوئٹہ پنجاب میں افسانہ کلب کی جانب سے ایک مومینٹو اور سند پیش کی گئی۔
- 7- 22 جون 2014ء کو مالگاؤں (مہاراشٹر) میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو سہتیہ اکیڈمی ممبئی کی جانب سے ”دقار ادب“ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔
- 8- 2014ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کی جانب سے ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ”اعتبار و معیار“ پر 5000 روپے کا انعام ملا۔
- 9- دسمبر 2014ء کو ڈاکٹر مشتاق احمد دوانی کو عربی فارسی اور اردو یونیورسٹی آف مدراس

- کی جانب سے ”کاوش بدری ایوارڈ“ سے سرفراز کیا گیا۔
- 10- 2014ء میں ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کو آل بے اینڈ کے ٹیچرس گلڈ کے ادبی میل کا چیف آرگنائزر نامزد کیا گیا۔
- 11- 10 مئی 2015ء کو افسانہ کلب ملیہ کوئٹہ (پنجاب) کی جانب سے ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کو مومینفو اور توصیفی سند پیش کی گئی۔
- 12- 2015ء میں حیدر آباد یونیورسٹی میں ”مشتاق احمد دانی کی افسانہ نگاری“ کے موضوع پر ارشد احمد کو چھ کوائم فل کی ڈگری تفویض کی گئی۔
- ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کی ادبی نگارشات پر مشاہیر ادب کے تاثرات ایک فہرست
- 1- محترم جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی)
 - 2- محترم جناب پروفیسر حامدی کشمیری (سری نگر)
 - 3- محترم جناب پروفیسر وہاب اشرفی مرحوم (پٹنہ)
 - 4- محترم جناب پروفیسر ظہور الدین (جموں)
 - 5- محترم جناب افتخار امام صدیقی مدیر ماہنامہ شاعر (ممبئی)
 - 6- محترم جناب کشمیری لال ذاکر (چنڈی گڑھ)
 - 7- محترم جناب پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی (دہلی)
 - 8- محترم جناب پروفیسر قمر رئیس مرحوم (دہلی)
 - 9- محترم جناب پروفیسر جاوید قدوس (جموں)
 - 10- محترم جناب جوگندر پال (دہلی)
 - 11- محترم جناب نور شاہ (سرینگر)
 - 12- محترم جناب پروفیسر عتیق اللہ (دہلی)
 - 13- محترم جناب محمد زماں آزرودہ (سرینگر)
 - 14- محترم جناب قاضی مشتاق احمد (پونہ)
 - 15- محترم جناب پروفیسر مجید بیدار (حیدر آباد)
 - 16- محترم جناب مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

- 17- محترم جناب پروفیسر محبوب راہی (مہاراشٹر)
- 18- محترم جناب ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)
- 19- محترم جناب پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی)
- 20- محترم جناب علی جاوید (دہلی)
- 21- محترم جناب پروفیسر اسلم جشید پوری (میرٹھ)
- 22- محترم جناب پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد)
- 23- محترم جناب انیس امروہی (دہلی)
- 24- محترم جناب ڈاکٹر شباب للت مرحوم (ہماچل پردیش)
- 25- محترم جناب علیم صبانویدی (مدراں)
- 26- محترم جناب پروفیسر ابوالکلام قاسمی (علیگڑھ)
- 27- محترم جناب محمد بشیر بلیر کوٹلوی (پنجاب)
- 28- محترم جناب دیپک کنول (ممبئی)
- 29- محترم جناب دیپک بدکی (غازی آباد)
- 30- محترمہ سیدہ نسرین نقاش (سری نگر)
- 31- محترم جناب پروفیسر صغیر افرامیم (علیگڑھ)
- 32- محترم جناب پروفیسر ابوالکلام (حیدر آباد)
- 33- محترم جناب احمد عثمانی (مالیگاؤں مہاراشٹر)
- 34- محترم جناب نور الحسنین (پونہ)
- 35- محترم جناب رفیق شاہین (علی گڑھ)
- 36- محترم جناب ہارون بی اے (مالیگاؤں مہاراشٹر)
- 37- محترم جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی (سری نگر)
- 38- محترم جناب پروفیسر شریف احمد قریشی (رام پور)
- 39- محترم جناب حقانی القاسمی (دہلی)
- 40- محترم جناب معین الدین عثمانی (مہاراشٹر)

- 41- محترم جناب روفق جمال (چھتیس گڑھ)
 - 42- محترم جناب ابو بکر عباد شعبہ اُردو (دہلی یونیورسٹی)
 - 43- محترم جناب امین بخارہ (جموں)
 - 44- محترم جناب عظیم راہی (مہاراشٹر)
 - 45- محترم جناب پروین کمار اشک (پٹھان کوٹ)
 - 46- محترم جناب ڈاکٹر پرویز شہریار (دہلی)
 - 47- محترم جناب محمد شاہد پٹھان (جے پور راجستھان)
 - 48- محترم جناب ڈاکٹر پریمی رومانی (جموں)
 - 49- محترم جناب ڈاکٹر سید اختیار جعفری (آگرہ)
 - 50- محترم جناب ڈاکٹر مجیب شہزاد (علگڑھ)
 - 51- محترم جناب ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (پٹنہ)
 - 52- محترم جناب عطا عابدی (پٹنہ)
 - 53- محترم جناب ڈاکٹر الطاف انجم اسٹینٹ پروفیسر فاصلاتی نظام تعلیم (کشمیر یونیورسٹی)
 - 54- محترم جناب ڈاکٹر ریاض احمد ریڈر شعبہ اُردو (جموں یونیورسٹی)
 - 55- محترم جناب ڈاکٹر چمن لعل بھگت اسٹینٹ پروفیسر شعبہ اُردو (جموں یونیورسٹی)
 - 56- محترم جناب ڈاکٹر رغبت شمیم ملک (دہلی)
- ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی اردو ادبی رسائل و جرائد میں شمولیت
- 1- ماہنامہ شاعر (ممبئی)
 - 2- ماہنامہ اردو دنیا (دہلی)
 - 3- ماہنامہ میناک (مالیگاؤں مہاراشٹر)
 - 4- ماہنامہ بیسویں صدی (دہلی)
 - 5- ماہنامہ شیرازہ (کلچرل اکیڈمی جموں کشمیر)
 - 6- دو ماہی پرواز ادب (پٹیاہ پنجاب)
 - 7- ماہنامہ پرواز (لندن)

- 8۔ سہ ماہی فکر و تحقیق (دہلی)
- 9۔ سہ ماہی مباحثہ (پٹنہ)
- 10۔ سہ ماہی قرطاس (ناگپور)
- 11۔ سہ ماہی اصناف ادب (بہار)
- 12۔ ماہنامہ نگینہ (کشمیر)
- 13۔ سہ ماہی انتساب (مدھیہ پردیش)
- 14۔ سہ ماہی تحریک ادب (بنارس)
- 15۔ ماہنامہ جہاں نما (گنگوہ)
- 16۔ سہ ماہی افق ادب (جمہار کھنڈ)
- 17۔ سہ ماہی کاوش (شاہجہان پور یو پی)
- 18۔ ماہنامہ رہنمائے تعلیم (دہلی)
- 19۔ سہ ماہی رنگ (دھنبا د بہار)
- 20۔ ششماہی تسلسل (جموں یونیورسٹی)
- 21۔ سہ ماہی مژگاں (کلکتہ)
- 22۔ سالنامہ ترسیل (فاصلاتی نظام تعلیم کشمیر یونیورسٹی)
- 23۔ ماہنامہ زریں شعاعیں (بنگلور)
- 24۔ سہ ماہی بزم ادب (کشمیر)
- 25۔ سہ ماہی ابجد (بہار)
- 26۔ سہ ماہی لمحے لمحے (بدایوں یو پی)
- 27۔ ماہنامہ تریاق (ممبئی)
- 28۔ ماہنامہ شاندار (اعظم گڑھ)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے توسیعی لیکچر

1۔ 2011 میں لکھنؤ میں Mass communication society کے زیر

اہتمام ”اودوزبان کی اہمیت و افادیت“ کے موضوع پہ لیکچر دیا اور ”باغی“ نام کی کہانی سنائی۔

- 2- کشمیر سینٹرل یونیورسٹی میں 2013ء میں ”آج کا اردو افسانہ“ کے موضوع پر لیکچر دیا۔
- 3- گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اڈھم پور میں مئی 2014ء میں ”اردو شعر و ادب میں تائیدیت“ کے موضوع پر لیکچر دیا۔
- 4- اگست 2014ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین اڈھم پور میں ’اردو افسانے کا تاریخی ارتقا اور اسکے فنّی لوازمات‘ پر لیکچر دیا۔
- 5- مئی 2015ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین گاندھی نگر جموں میں ’اردو ادب میں تائیدی رجحانات‘ پر لیکچر دیا اور ’بہی نام کی کہانی پڑھ کر سنائی‘۔
- 6- 8 جون سے 13 جون 2015ء تک سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن جموں میں ’اردو ناول ایک تعارف‘، ’ترقی پسند تحریک‘، ’جدید اردو افسانہ‘، ’عصری معاشرہ اور اخلاقی اقدار کی اہمیت‘ اور ’اردو کا صوتیاتی نظام موضوعات‘ پر لیکچر دیئے۔
- 7- ریڈیو کشمیر جموں کے ادبی پروگرام ’خزمن‘ سے 26 سالہ وابستگی۔

نجی زندگی

- 1- علاقہ مرمت (ضلع ڈوڈہ) سے ماسٹری تحصیل چہینی۔ ضلع اڈھم پور میں ہجرت 1981ء میں۔
- 2- ازدواجی زندگی میں داخلہ: 6 اکتوبر 1991ء میں۔
- 3- رفیقہ حیات کا نام: راشدہ اختر (لیکچرر اردو (2+10))
- 4- اولاد: رضا الرحمان (بیٹا) الیکٹریکل انجینئرنگ میں زیر تربیت۔ اور صبا کریم (بہی) دسویں جماعت میں زیر تعلیم۔
- 5- ضلع اڈھم پور سے ضلع جموں میں اپنے آبائی وطن میں تاریخ رہائش 6 اپریل 2011ء

7- پتہ۔ Dr Mushtaq Ahmed wani

Lane No 3 House No. 7

Firdousabad Sunjwan Jammu Tawi

pincode No 180011

Mobile No. 09419336120

Email: drmushtaqahmedwani@gmail.com



ANDAR KI BATEIN

(Short Stories)

by

Dr. Mushtaq Ahmed Wani



مشتاق احمد وانی جتنا سچا مومن ہے اتنا ہی کھرا افسانہ نگار بھی ہے اس کی افسانوی کارگزاری صرف اس کے آبائی صوبے ہنوں کشمیر تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں رسائل و جرائد کے وسیلے سے پھیلی ہوئی ہے! مشتاق کے ہاں کہانی پن شروع تا آخر موجود رہتا ہے جس کی وجہ سے قاری اُس کے افسانے کی روح تک پہنچ جاتا ہے! وہ ہجرت اور مہم، استعاروں سے پرہیز کرتا ہے! اپنے قاری کو گھجک اور بے کیف پہیلیاں نہیں بچھاتا! مشتاق وانی صرف انہیں موضوعات کا انتخاب کرتا ہے

جن کا علاقہ ہماری زمین اور انسانی زندگی سے استوار ہوتا ہے! زندگی کے مختلف شعبہ جات میں برپا سیاسی و معاشی بدعنوانیوں کے زہر کو آبی قطرہ قطرہ اپنے روح و قلب میں اتارتا ہے! جب موضوع اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اُس پر روشن ہو جاتا ہے تب اس کی افسانوی ادائیگی کے لئے وہ اسلوب اور الفاظ تلاش کرتا ہے! آوازی کے افسانوں میں عام آدمی کے خوں چکان تجربات و مشاہدات اس طور اجاگر ہوتے ہیں جیسے آئی نے ان کو اپنے حساس وجود پر خود بھوگا ہوا ہوا!! مشتاق وانی کے افسانوں کا اختتامیہ ایک خوبصورت نظم ایک خوبصورت شعر کی طرح ہمیں چونکاتا ہے اور اس کا افسانہ تادیر وجدان میں محفوظ رہتا ہے۔

پروین کمار اشک

Mob. 09855653990

معاصر اردو ادب میں مشتاق وانی ایک مانوس قلم کار کا نام ہے۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کو یکساں طور پر ایک معیار کے ساتھ برتا آسان نہیں۔ لیکن مشتاق وانی ایسا کر گزرتے ہیں۔ اس سے اُن کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تائید کے حوالے سے اُن کی مفصل تصنیف اُن کے وسیع و عریض علم کا تازہ ثبوت ہے۔ فکشن کی تنقید اُن کی تنقیدی سرگرمیوں کا نمایاں پہلو تو ہے ہی، لیکن ساتھ ہی ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت سے بھی مشتاق وانی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اُن کے کئی افسانے ہیں جو انہیں معاصر افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ دلوانے کی ضمانت ہیں۔ لیکن ان کا افسانہ ”اندہ کی باتیں“ کئی اعتبار سے ایک عمدہ مابعد جدید افسانہ کہلانے کا سزاوار ثابت ہوتا ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید

Mob. 09419010472

**EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE**

www.ephbooks.com



978-93-5073-707-1